بسم اللہ الرحمن الرحیم

محمود، فاروق، فرزانہ اور انسپکٹر جمشید سیریز ۱۸۲

ٹرین کی تلاش

اشتیاق احمد

ناول پڑھنے سے پہلے یہ دیکھ لیں کہ:

- یہ وقت نماز کا تو نہیں —
- آپ کو سکول کا کوئی کام تو نہیں کرنا —
- کل آپ کا کوئی ٹسٹ یا امتحان تو نہیں —
- آپ نے کسی کو وقت تو نہیں دے رکھا —
- آپ کے ذمے گھر والوں نے کوئی کام تو نہیں لگا رکھا۔

اگر ان باتوں میں سے کوئی ایک بات بھی ہو تو ناول الماری میں رکھ دیں، پہلے نماز اور دوسرے کاموں سے فارغ ہو لیں، پھر ناول پڑھیں — شکریہ!

مخلص:

اشتیاق احمد

ٹرین کا سودا

"ہیلو سر — ایک گھنٹا گزر چکا ہے — گاڑی ابھی تک نہیں پہنچی۔" سٹیشن ماسٹر نے اپنے آفیسر کو فون پر بتایا۔

"تم نے پچھلے سٹیشن کو فون کیا حیات خان؟"

"ہاں جناب — ان کا کہنا ہے — کہ وہاں سے گاڑی ٹھیک ایک گھنٹا پہلے روانہ ہو چکی ہے۔"

"کک — کیا کہا — تت — تم — تم کیا کہنا چاہتے ہو۔" آفیسر حلق پھاڑ کر چلایا۔

"آپ بالکل درست سمجھے ہیں سر — مومن پور سٹیشن سے ہمارے سٹیشن راول گنج کا فاصلہ پورے ایک گھنٹے کا ہے — گویا اس وقت گاڑی کو ہمارے سٹیشن پر ہونا چاہیے تھا۔" حیات خان بولا —

"تب پھر — درمیان میں کہیں کوئی گڑ بڑ ہو گئی ہے — اس فاصلے میں کتنے پھاٹک والے ہیں؟" آفیسر نے پوچھا۔

"جی۔ تین پھاٹک ہیں۔ چند موڑ اور ایک سرنگ بھی ہے۔ اور دو پل ہیں۔"

"ہوں! میں آ رہا ہوں۔ ہم جیپ میں لائن کے ساتھ سفر کریں گے۔ بہت جلد ہم گاڑی تک پہنچ جائیں گے، لیکن مجھے یقین ہو چلا ہے کہ گاڑی کسی حادثے کا شکار ہو گئی ہے۔"

"اللہ اپنا رحم فرمائے۔" سٹیشن ماسٹر حیات خان نے گھبرا کر کہا۔

تھوڑی دیر بعد دونوں جیپ میں سفر کرتے لائن کے ساتھ ساتھ جا رہے تھے۔ آدھ گھنٹے بعد وہ نصف فاصلہ طے کر چکے تھے۔ اور پھر ان کی پیشانیوں پر بل پڑنے لگے۔ کیونکہ ابھی تک تو گاڑی کا کہیں نام و نشان نظر نہیں آیا تھا:

"یہ۔ یہ سب کیا ہے بھئی؟" آفیسر نے کہا۔

"ہو سکتا ہے سر۔ مون پور سے روانہ ہونے کے کچھ ہی دیر بعد گاڑی کو کوئی حادثہ پیش آ گیا ہو۔" سٹیشن ماسٹر نے کہا۔

"ہوں! اس کا مطلب ہے، ہمیں اپنا سفر ابھی جاری رکھنا چاہیے۔"

"جی ہاں! جب یہاں تک آ گئے ہیں تو آگے کیوں نہ جائیں۔

آخر ہمیں گاڑی تک جانا ہے۔" آفیسر نے منہ بنا کر کہا۔

جیپ چلتی رہی، پھر ان کی آنکھوں میں حیرت دوڑنے لگی:

"گگ۔ کہیں۔ کہیں ہم خواب تو نہیں دیکھ رہے۔" آفیسر نے کانپتی آواز میں کہا۔

"جی کیا مطلب۔ ہم دونوں ایک ساتھ ایک ہی خواب کس طرح دیکھ سکتے ہیں۔" حیات خان نے حیران ہو کر کہا۔

"تب پھر۔ وہ دیکھو۔ سامنے مون پور کا سٹیشن نظر آنے لگا ہے۔ لیکن گاڑی کا تو کہیں بھی پتا نہیں۔"

"اُف مالک۔ گاڑی کہاں گئی۔" حیات خان کی آواز کانپ گئی۔ چند لمحے پتھرائی آنکھوں سے اس طرف دیکھتا رہا، پھر اس کے منہ سے نکلا:

"گگ۔ گاڑی۔ گاڑی۔" اور پھر وہ اپنی سیٹ سے نیچے لڑھک گیا۔ وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔

"ارے ارے۔ یہ کیا بھئی۔" آفیسر نے بوکھلا کر جیپ روک دی۔ اور سٹیشن ماسٹر کو جھنجھوڑنے لگا۔ پھر وہ پیدل سٹیشن کی عمارت کی طرف لپکا۔

جونہی وہ سٹیشن ماسٹر کے کمرے میں داخل ہوا، سٹیشن ماسٹر اچھل کر کھڑا ہو گیا:

"س۔ سر۔ آپ۔"

"ہاں ہیں — لیکن گاڑی کہاں ہے؟" اس نے بھنّا کر کہا۔

"ج — جی — گاڑی — گ — کیا مطلب؟"

"ہم راول گنج سے روانہ ہوئے ہیں — اور یہاں تک پہنچ گئے ہیں — پورے راستے میں ہمیں گاڑی کہیں بھی نظر نہیں آئی"۔

"کیا!!!" وہ منہ پھاڑ کر بولا اور پھر گرتا چلا گیا —

★

راول گنج کے ملٹری آفس میں اس وقت ملٹری کے اعلیٰ آفیسرز جمع تھے — ان سب کے چہروں پر انتظار کی کیفیت طاری تھی — وہ بار بار گھڑیوں پر نظر ڈال رہے تھے، آخر ایک آفیسر نے کہا:

"اس وقت تک تو کیپٹن ارشد اور اس کے ماتحت کو یہاں پہنچ جانا چاہیے تھا"۔

"ہاں! گاڑی کو ٹھیک گیارہ بجے سٹیشن پر پہنچنا تھا — سٹیشن سے یہاں تک کا راستا جیپ کے ذریعے پندرہ منٹ کا ہے، لیکن نہ جیپ یہاں پہنچی، نہ کیپٹن ارشد — جب کہ ہمارے ہاں وقت کی پابندی بہت لازمی ہے"۔ ایک اور آفیسر بولے۔

"ہمیں سٹیشن فون کر کے معلوم کرنا چاہیے — کہیں گاڑی

لیٹ تو نہیں ہو گئی"۔ ایک اور صاحب بولے۔

"لیکن سر — ہم تو پہلے ہی سٹیشن کو فون کر چکے ہیں اور ان کی طرف سے جواب ملا تھا کہ گاڑی ٹھیک وقت پر پہنچ رہی ہے"۔

"ہو سکتا ہے، کوئی فوری بات ہو گئی ہو، فون کر لینے میں کیا حرج ہے"۔

"ہوں ٹھیک ہے"۔

ایک آفیسر نے کہا اور فون کی طرف ہاتھ بڑھا دیے۔ انھوں نے جلدی جلدی نمبر ملائے، پھر بولے:

"ہیلو — ملٹری آفس سے بول رہا ہوں — گیارہ بجے والی گاڑی آ چکی ہے یا نہیں؟"

"ج — نہیں —" دوسری طرف سے کسی نے کہا۔

"نہیں آئی — لیکن تھوڑی دیر پہلے تو بتایا گیا تھا کہ گاڑی ٹھیک وقت پر آ رہی ہے اور اب — اب تو پندرہ منٹ زیادہ ہو چکے ہیں"۔

"درمیان میں کوئی بات ہو گئی ہے سر — سٹیشن ماسٹر صاحب ایک آفیسر کے ساتھ مُون پور کی طرف گئے ہیں"۔

"لیکن انھیں جانے کی کیا ضرورت تھی — وہ مُون پور سٹیشن فون نہیں کر سکتے تھے؟" ملٹری آفیسر نے حیران ہو کر پوچھا۔

"فون کیا تھا۔ انھوں نے یہی بتایا کہ گاڑی یہاں سے ٹھیک وقت پر روانہ ہو چکی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہی ہے سر کہ گاڑی کو ٹھیک گیارہ بجے راول گنج پہنچ جانا چاہیے تھا، لیکن نہیں پہنچی — اور مون پور سے وہ روانہ ہو چکی ہے — صاف ظاہر ہے — درمیان میں کہیں کوئی گڑبڑ ہوئی ہے۔ اور اسی گڑبڑ کو معلوم کرنے کے لیے وہ حضرات گئے ہیں۔"

"ہوں — میں سمجھ گیا — اچھا ملٹری آفس کا نمبر نوٹ کر لیں، جونہی کوئی اطلاع ملے۔ ہمیں فون کر دیں۔"

"بہت بہتر جناب۔"

ملٹری آفیسر نے نمبر بتا کر ریسیور رکھ دیا اور باقی لوگوں کو صورتِ حال بتائی:

"مجھے تو کسی بڑی گڑبڑ کا احساس ہو رہا ہے۔" ایک صاحب بڑبڑائے۔

"لیکن — کیپٹن ارشد اور اس کا ماتحت گڑبڑ سے نپٹنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔" ایک اور آفیسر نے کہا۔

"لیکن سر — اگر گڑبڑ ریلوے سے متعلق ہوئی تو وہ کیا کر سکیں گے۔"

"اس صورت میں وہ کسی دوسری سواری سے یہاں پہنچنے کی کوشش کریں گے — انھیں یہ بات معلوم ہے کہ ان کا یہاں پہنچنا کتنا ضروری ہے۔"

"پتا نہیں کیوں — میں الجھن محسوس کر رہا ہوں۔"

"الجھن تو خیر ہم سبھی محسوس کر رہے ہیں۔"

"لیکن اس سے ہوتا کیا ہے — یہ —"

اسی وقت فون کی گھنٹی بجی — اسی آفیسر نے ریسیور اٹھایا، جس نے فون کیا تھا:

"ہیلو — ملٹری آفس۔"

"گاڑی سٹیشن تک نہیں پہنچے گی جناب۔" دوسری طرف سے شوخ آواز میں کہا گیا۔

"کیا مطلب؟" وہ چونکے۔

"مطلب یہ کہ انتظار کرنا بے سود ہے — گاڑی نہیں پہنچے گی۔"

"کیوں نہیں پہنچے گی — آپ کون ہیں — پہلے اپنا تعارف کرائیں۔"

"ہاں ضرور — تعارف تو کرانا ہو گا — میں ہوں سالار بیگ۔"

"اور مسٹر سالار بیگ — آپ کیا چاہتے ہیں؟"

"یہ بتانا کہ ٹرین کا انتظار فضول ہے — کوئی اور کام کریں۔"

"کوئی اور کام کیا؟"

"ٹرین کا سودا کر لیں۔"

"کیا کہا؟" آفیسر پوری قوّت سے چلّایا۔

"فون کے تار خراب ہو جائیں گے جناب۔ اس قدر زور سے نہ چلّائیے۔ ابھی تو آپ کو بہت کچھ سُننا اور برداشت کرنا ہے۔"

"تت۔ تم۔ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"ٹرین کی قیمت لگائیے۔"

"ہم کیوں لگائیں۔ ریلوے والوں سے بات کرو۔ ارے تو کیا تم نے ٹرین کو اغوا کر لیا ہے۔"

"ہاں! آپ یہ بھی کہ سکتے ہیں۔" دوسری طرف سے ہنس کر کہا گیا۔

"اوہ!" ان کے منہ سے نکلا۔

"اب کیا خیال ہے۔ بات کرنے کا ارادہ ہے یا نہیں؟"

"نہیں۔ ٹرین کی بات ٹرین والوں سے کریں۔"

"لیکن۔ آپ لوگ بھی تو ٹرین کا انتظار کر رہے ہیں اور جس بے چینی سے کر رہے ہیں۔ وہ مجھ سے چھپی نہیں۔"

"آخر تم ہو کون؟"

"بتا تو چکا ہوں۔ سالار بیگ۔"

"کہاں سے فون کر رہے ہو؟"

"ایک پبلک فون بوتھ سے۔ خیر۔ مَیں کچھ دیر بعد پھر فون کروں گا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں۔ آپ لوگوں کو ٹرین کی ان سے زیادہ ضرورت ہے۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی ریسیور رکھ دیا گیا۔

آفیسر نے بھی ریسیور رکھ کر کھوئے کھوئے انداز میں گفت گو دہرا دی، پھر کہا:

"اور شاید۔ وہ جانتا ہے۔ کہ اس ٹرین کی کیا اہمیت ہے۔"

"ہوں! لیکن۔ سب سے زیادہ حیرت انگیز بات تو یہ ہے کہ اس نے ٹرین کو کہاں غائب کر دیا اور کیسے۔ ٹرین کوئی ننھی سی گڑیا تو نہیں ہوتی۔"

"واقعی۔ یہ شاید اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ ہو گا۔"

"خیر۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ آج کل تو ہوائی جہاز اور بحری جہاز اغوا ہو جاتے ہیں۔"

"ان کا اغوا ہونا اور بات ہے۔ ٹرین ہوا میں اُڑ کر نہیں جاتی۔ نہ سمندر میں ہوتی ہے۔ ریلوے لائن پر سفر کرتی ہے، پھر وہ غائب کہاں ہو سکتی ہے اور کس طرح؟"

"آج کے دور میں کیا مشکل ہے۔"

ٹھیک ایک گھنٹے بعد جیپ ڈرائیور کمرے میں داخل ہوا، اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں:

"س - سر - ٹرین غائب ہو چکی ہے - مون پور اور راول گنج کے درمیان اس کا کہیں کوئی پتا نہیں۔"

"اُف مالک - یہ - یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

"یہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے - جیسے کسی نے جادو کر دیا ہو، جادو کے زور سے ٹرین کو غائب کر دیا گیا ہو۔"

"میرا خیال ہے - ہمیں فوری طور پر کمانڈر انچیف کو اطلاع دینی چاہیے - کہیں وہ ہم پر ناراض نہ ہوں - کہ انھیں کیوں اطلاع نہیں دی گئی۔" ایک آفیسر نے تجویز پیش کی۔

"ہوں - ٹھیک ہے۔"

اطلاع کمانڈر انچیف کو دی گئی - وہ دوڑے آئے - چہرہ دھواں ہو رہا تھا:

"شش - شاید میں نے اپنی زندگی کی حیرت انگیز ترین خبر سُنی ہے۔"

"سوال یہ ہے سر - کہ کیا کیا جائے - ادھر ایک شخص سالار بیگ نے ہمیں فون کیا تھا - وہ کہتا ہے، ٹرین کا سودا کر لو۔"

"کیا!!" وہ چلّائے -

"ہاں - اس کا بیان ہے - ٹرین کو اس نے اغوا کیا ہے۔"

"پھر - تم نے اس سے کیا کہا؟"

"ہم نے تو اسے کوئی گھاس ہی نہیں ڈالی سر۔"

"بُرا کیا - اس سے بہت نرمی سے بات کرنی چاہیے تھی - معلوم تو ہو - وہ کیا چاہتا ہے - ٹرین ہمیں کس طرح واپس ملے گی۔"

"ہوں! آپ ٹھیک کہتے ہیں سر - ہم سے غلطی ہوئی - لیکن وہ پھر فون کرے گا سر۔"

اسی وقت فون کی گھنٹی بجی:

"لیجیے - شاید یہ وہی ہے۔" اسی آفیسر نے ریسیور کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ٹھہرو - میں بات کروں گا۔" کمانڈر انچیف بولے۔

پھر انھوں نے ریسیور اُٹھا لیا اور بولے:

"ہیلو - ملٹری آفس۔"

"... کیا خیال ہے؟"

"... بارے میں؟" انھوں نے کہا۔

"ٹرین کا سودا کرنے کے بارے میں - اب تک تو آپ کو ... ہو گا کہ ٹرین کو اغوا کر لیا ہے۔" اس نے مزے ... کہا -

"ہاں، معلوم ہو چکا ہے - تم کیا کہتے ہو۔" وہ نرم آواز میں بولے۔

"... مان گئے نا ہار - میں پہلے ہی جانتا تھا - اچھا خیر - ٹرین کے پانچ کروڑ روپے دے دیں۔"

"... رہے ہو۔" کمانڈر نے بھنّا کر کہا۔

"ارے — تو کیا پانچ کروڑ زیادہ ہیں۔"

"پانچ کروڑ میں تو نہ جانے کتنی گاڑیاں بن جائیں گی۔"

"لیکن اس گاڑی پر سواریاں بھی موجود ہیں اور پھر ایک اد
خاص چیز بھی موجود ہے — وُہی چیز — جس کے لیے آپ لوگ
بُری طرح بے چین ہیں۔"

"اوہ — تو تم یہ بھی جانتے ہو۔"

"اگر جانتا نہ ہوتا تو پھر آپ کو فون کیوں کرتا۔"

"ہوں — لیکن پانچ کروڑ ہم نہیں دے سکتے — ہمارا ملک
اتنا بوجھ برداشت نہیں کر سکتا۔"

"تب پھر میں شارجستان کے کمانڈر انچیف سے سودا کر
لیتا ہوں۔"

"کیا!!!" وہ پوری قوت سے دھاڑے —

ایک اور پہلو

"کیا ہوا سر؟" ایک آفیسر نے گھبرا کر کہا۔ باقی سب کے بھی رنگ اڑ گئے تھے، کیونکہ کیا کے ساتھ ہی ان کے ہاتھ سے ریسیور چھوٹ گیا تھا۔

انھوں نے کوئی جواب دیے بغیر جلدی سے ریسیور اٹھایا، ادھر سے بدستور ہیلو ہیلو کہا جا رہا تھا:

"ہیلو!" کمانڈر انچیف بولے۔

"کیا ہو گیا جناب — آپ خاموش کیوں ہو گئے تھے — شارجستان ان کاغذات کے پانچ کروڑ فوراً ادا کرنے کے لیے تیار ہو جائے گا۔"

"ہاں! تم ٹھیک کہتے ہو۔" انھوں نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

"تب پھر — آپ کیا کہتے ہیں۔"

"کیا تم وہ کاغذات حاصل کر چکے ہو؟"

"نہیں! اگر کر چکا ہوتا۔ تو پھر آپ کو فون کیوں کرتا۔ پھر تو میں پہلے شارجستان کو فون کرتا۔"

"ہوں! میں سمجھ گیا۔ ٹرین، ٹرین کے مسافر اور وہ کاغذات تمہارے قبضے میں ضرور ہیں، لیکن کاغذات ابھی تک تم حاصل نہیں کر سکے۔ کیونکہ تمہارا سابقہ کیپٹن ارشد سے ہے۔ کیپٹن ارشد جو بہت ذہین ہے۔ اس نے کاغذات نہ تو اپنے پاس رکھے ہوں گے۔ اور نہ اپنے اسسٹنٹ کے پاس۔ ضرور وہ کہیں اور ہیں۔ اور تم لوگوں کو پہلے ہی یہ اُمید تھی کہ کاغذات فوری طور پر نہیں مل جائیں گے۔ لہٰذا تم نے ٹرین کو ہی اغوا کرنے کا پروگرام بنا لیا۔"

"ہاں! یہی بات ہے۔ لیکن کب تک۔ آخر ہم کاغذات حاصل کر لیں گے۔ اس سے پہلے اگر آپ لوگ سودا کر لیں تو ہم ٹرین اور مسافر آپ کے حوالے کرنے کے لیے تیار ہیں۔ بس آپ رقم کا بندوبست کریں۔"

"مجھے مہلت دو۔ یہ معاملہ چھوٹا نہیں ہے۔ صدر تک سے بات کرنا پڑے گی۔"

"ہاں! میں جانتا ہوں ۔ میں آپ لوگوں کو چار گھنٹے کی مہلت دیتا ہوں۔ ان چار گھنٹوں کے دوران میں بھی کاغذات حاصل کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔ پھر ہو سکتا ہے۔

یہ معاملہ پانچ کروڑ میں بھی مجھے منظور نہ ہو۔ لہٰذا آپ لوگ جلدی کریں۔ پانچ کروڑ قیمت صرف اس وقت تک ہے جب تک کہ مجھے کاغذات نہیں مل جاتے۔"

"میں سمجھ رہا ہوں۔ خیر۔ تم ٹھیک چار گھنٹے بعد مجھے فون کرنا۔"

"یہ میں ضرور کروں گا۔ فکر نہ کریں۔" اس نے ہنس کر کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

کمانڈر انچیف نے خالی خالی نظروں سے اپنے سب ساتھیوں کی طرف دیکھا، پھر فون پر جھک گئے۔ اب وہ جلدی جلدی۔ وزیرِ خارجہ، وزیرِ داخلہ اور صدر صاحب کو فون کر رہے تھے۔

ایک گھنٹے بعد تمام لوگ وہاں جمع ہو چکے تھے۔ اور ان کے رنگ اڑے ہوئے تھے۔

"اب ہمارے پاس چار گھنٹے ہیں۔ چار گھنٹے گزرنے سے پہلے ہمیں ٹرین کا سراغ لگانا ہے۔ اور ہم لوگ صرف انسپکٹر [illegible] سے یہ کام لے سکتے ہیں اور یہ اُمید کر سکتے ہیں کہ وہ چار گھنٹے کے اندر اندر ٹرین کا سراغ لگا لیں گے۔" وزیرِ داخلہ نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"یہ تو مشکل ہے۔" صدر صاحب بولے۔

"جی۔ کیا مطلب؟" تمام لوگ چونکے۔

"انسپکٹر جمشید، محمود، فاروق، فرزانہ، خان رحمان اور پروفیسر داؤد ان دنوں ملک کے کسی نا معلوم مقام پر چھٹیاں منا رہے ہیں۔"

"جی۔ یہ۔ یہ کیا بات ہوئی سر۔ نامعلوم مقام پر۔"

"ہاں! ایک ہفتہ پہلے پروفیسر داؤد نے مجھ سے بات کی تھی، انھوں نے کہا تھا۔ کہ وہ، خان رحمان اور انسپکٹر جمشید فیملی اپنے فرائض مسلسل انجام دیتے دیتے اس حد تک تھک گئے ہیں کہ اب کچھ دن کے لیے انھیں آرام کرنا چاہیے۔ لیکن وہ جانتے ہیں کہ جہاں بھی جائیں گے۔ ضرورت پڑنے پر انھیں بلا لیا جائے گا۔ لہٰذا اس مرتبہ ان سب نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ کسی نا معلوم مقام پر چلا جائے تاکہ کوئی یہ نہ معلوم کر سکے کہ وہ کہاں ہیں۔ میں نے ان کی یہ تجویز منظور کر لی اور وہ سب چھٹیاں لے کر نکل گئے۔ اب ہم نہیں جانتے۔ وہ کہاں ہیں۔"

"اوہ۔ یہ۔ یہ تو بُرا ہوا سر۔"

"خیر۔ ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ ہم دوسرے ماہر لوگوں کو اس کام پر لگا دیتے ہیں۔ اور ریڈیو، ٹی وی وغیرہ پر اعلان نشر کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اعلان یہ ہو گا کہ

انسپکٹر جمشید وغیرہ جہاں کہیں بھی ہیں۔ فوراً راول گنج پہنچ جائیں۔"

"بہت بہتر۔ اس کے سوا کیا ہی کیا جا سکتا ہے۔" وزیرِ داخلہ بولے۔

"اور دوسرے یہ کہ ایک ذمّے دار آدمی اس فون پر ہر وقت موجود رہے۔ تاکہ مجرم جس وقت بھی بات کرنا چاہے، کر سکے۔" صدرِ مملکت بولے۔

"بالکل ٹھیک۔ تو پھر اب ہمیں اپنے پاس موجود بہترین افراد کو ٹرین کے سُراغ پر لگا دینا چاہیے۔"

"جی۔ جی ہاں۔ ٹرین کی تلاش مون پور سٹیشن سے [illegible] اور راول گنج تک جاری رہے گی۔ درمیانی تمام علاقے کا جائزہ لیا جائے گا اور یہ معلوم کرنے کی سرتوڑ کوشش کی جائے گی کہ آخر ٹرین کس طرف لے جائی گئی ہے اس کے لیے۔ ریلوے کے ماہرین اور خاص طور پر تمام لوگ ہمارے ساتھ رہیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ یہ طے رہا۔ لیکن ہمیں دوسرے پہلو کو بھی دیکھنا چاہیے۔" صدر صاحب بولے۔

"جی۔ دوسرا پہلو۔ کیا مطلب؟"

"اگر ہم کامیاب نہ ہو سکے۔ تو کیا کریں گے۔"

"اس صورت میں ہم بلیک میلر کا مطالبہ ماننے پر مجبور ہو

جائیں گے۔"

"اور ہمیں دُعا کرنی چاہیے کہ وُہ لوگ ان کاغذات کو تلاش نہ کر سکیں۔" صدر صاحب بولے۔

"لیکن سر۔ آخر کب تک۔ کبھی نہ کبھی تو کیپٹن ارشد اور اس کے اسسٹنٹ مجبور ہو جائیں گے۔ وُہ بتا دیں گے کہ کاغذات کہاں ہیں۔" ایک آفیسر نے کہا۔

"کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ بس ہم صرف اللہ سے دُعا کر سکتے ہیں۔"

"تو پھر اس وقت یہ میٹنگ بھی دُعا پر کیوں نہ ختم کی جائے۔" صدر صاحب بولے۔

اور ان کے ہاتھ دُعا کے لیے اُٹھ گئے۔

★

ٹرین چلتے چلتے رُک گئی۔ کیپٹن ارشد نے چونک کر گھڑی پر نظر ڈالی اور بولا:

"لو بھئی راشد ہم راول گنج پہنچ گئے۔ سردی اتنی شدید ہے کہ۔ تمام راستے ہم کھڑکی تک کھولنے کی جرأت نہیں کر سکے۔ لیکن اب فرض کی ادائیگی کے لیے ہمیں اس سردی میں باہر نکلنا

ہو گا۔"

"ہاں سر۔ لیکن سردی کے یہ لمحات جلد ہی ختم ہو جائیں گے۔ ملٹری آفس خوب گرم ہو گا۔"

"ہم اس وقت تک کاغذات کی طرف ہاتھ نہیں بڑھائیں گے۔ جب تک کہ ہمارے ساتھی اس ڈبے تک نہیں پہنچ جاتے۔" ارشد بولا۔

"آپ شروع سے ہی بہت زیادہ احتیاط کر رہے ہیں، جب کہ میرا خیال ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ دُور دُور تک خطرہ موجود نہیں ہے۔" راشد نے منہ بنا کر کہا۔

"بے شک خطرہ موجود نہ ہو۔ لیکن احتیاط کرنا ہمارا فرض ہے۔ یہ پورے مُلک کا مسئلہ ہے راشد۔ میرا یا تمھاری ذات کا نہیں۔" ارشد نے کہا۔

"ہوں! یہ بھی ٹھیک ہے۔ اس کا مطلب ہے۔ ہمیں انتظار کرنا ہو گا۔"

"بالکل اسی طرح بیٹھے رہو۔"

اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ کیپٹن ارشد کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

"شاید ہمارے ساتھی آ گئے۔ تم دروازے کی چٹخنی گرا دو راشد۔" کیپٹن نے کہا۔

اس نے اُٹھ کر چٹخنی گرا دی۔ اور پھر اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ وُہ اُلٹ کر ڈبّے کے فرش پر گرا تھا۔ ارشد بوکھلا کر اُٹھا، لیکن اتنی دیر میں چار آدمی اندر داخل ہو چکے تھے اور رائفلیں ان کے ہاتھوں میں تھیں۔

"خبردار۔ حرکت نہ کرنا۔"

"گگ۔کیا مطلب؟"

"مطلب بھی معلوم ہو جائے گا۔ فی الحال تم ہاتھ پیر بندھوا لو۔ اگر ذرا بھی حرکت کی تو یہیں ڈھیر نظر آؤ گے۔"

"تم لوگ مُوت کو آواز دے رہے ہو۔" ارشد غرّایا۔

"ہاں! لیکن اپنی نہیں۔ تمھاری۔"

دونوں کو جلدی جلدی رسی سے جکڑ دیا گیا۔

"بہت خوب۔ اب ذرا یہ بتا دو۔ وُہ کاغذات کہاں ہیں؟"

"نہیں !!!" ارشد پُوری قوّت سے چلّایا۔ اس کے لہجے میں بلا کی حیرت تھی۔

"نہیں۔کیا مطلب؟" حملہ آور بولا۔

"تت۔ہمیں ان کاغذات کی کیا خبر؟" ارشد نے بوکھلا کر کہا۔

"خبر نہ ہوتی تو ہم اس ٹرین کو کیوں اغوا کرتے۔"

"کک۔کیا کہا۔ ٹرین کو اغوا کیوں کرتے۔ تت تو۔

ا تم اس ٹرین کو اغوا کر چکے ہو؟"

"ہاں! جھون پور سے روانہ ہونے کے بعد ٹرین کو اغوا کر لیا گیا ہے۔ اس وقت اسے راول گنج کے سٹیشن پر ہونا چاہیے تھا، لیکن یہ ایک نامعلوم مقام پر موجود ہے۔"

"یہ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اس نامعلوم مقام تک اخر ریل کی لائن کس طرح بچھائی گئی۔"

"یہ سب کچھ کیا جا چکا ہے۔ اب اس پر بات کرکے ہم وقت ضائع نہیں کر سکتے۔ اصل سوال تو یہ ہے کہ کاغذات کہاں ہیں؟"

"لیکن تم یہ کیوں پُوچھ رہے ہو۔ ابھی تو تم نے ہماری کسی کی تلاشی بھی نہیں لی۔"

"ہم جانتے ہیں۔ کاغذات نہ تو تم میں سے کسی کی جیبوں ہو سکتے ہیں۔ نہ سامان میں، ان کو کہیں اور رکھا گیا ہو اور ہم تلاش کرنے میں وقت نہیں ضائع کر سکتے۔

ا تم سے پُوچھ رہے ہیں۔"

"خوش فہمی میں مبتلا ہو۔" ارشد نے کہا۔

"کیا مطلب؟ کیسی خوش فہمی؟"

"اگر تم یہ خیال کر رہے ہو کہ ہم کاغذات کے بارے بتا دیں گے تو یقیناً خوش فہمی میں مبتلا ہو۔ ہم وُہ نہیں۔

...تھا۔ جو اپنی جان بچانے کے لیے ملک کا راز تمہارے حوالے کر دیں گے۔"

"ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے۔ ابھی تو پروگرام شروع ہوا ہے" ایک بولا۔

"تو پھر — پروگرام شروع کر لو۔ اپنے دین کے لیے اور اپنے وطن کے لیے جان قربان کرنا جانتے ہیں۔"

"ہاں یہ بات ہمیں — معلوم ہے۔ ہمارا باس بتا چکا ہے۔ لیکن جان قربان کرنا آسان ہے۔ سسک سسک کر جان دینا مشکل ہے۔"

"اللہ مالک ہے۔"

"گویا تم سیدھی طرح نہیں بتاؤ گے۔"

"نہیں۔ ہم تو اُلٹی طرح بھی نہیں بتائیں گے۔"

"اچھی بات ہے۔ اُٹھاؤ بھئی انھیں۔"

دونوں کو اُٹھا کر باہر لایا گیا۔ باقی تمام لوگوں کو رائفل کے زور پر نیچے اُتارا جا رہا تھا۔ سب لوگ خوف زدہ تھے۔ حیران اور پریشان تھے۔ ان کے ہاتھ اُوپر اُٹھے ہوئے تھے —

"تت — تم — صرف ہم دو آدمیوں کے لیے پوری ٹرین کو لے آئے۔ آخر ان لوگوں کا کیا قصور ہے؟" ارشد نے بھنّا کر کہا۔

"مجبوری ہے — ہم جانتے تھے۔ کاغذات تم لوگوں کے پاس

سے برآمد نہیں ہو سکیں گے۔ لہٰذا ٹرین کو ہی اغوا کرنا پڑا۔"

"اس کا مطلب ہے — تیاریاں پہلے ہی مکمل کر لی گئی تھیں۔"

"ظاہر ہے — ایسا نہ کیا جاتا تو ٹرین کس طرح اغوا کی جا سکتی تھی۔" ایک نے مسکرا کر کہا۔

"یہ — یہ کون سی جگہ ہے؟" ارشد نے گردن گھمانے کی کوشش کی —

"نہیں بتایا جا سکتا۔ اس جگہ کی تلاش میں تو اب تمہارے ... کے نہ جانے کتنے ماہر نکل کھڑے ہوں گے — لیکن وہ ...ب سر توڑ کوشش کے باوجود یہاں نہیں پہنچ سکیں گے۔"

"ہوں — اس کا مطلب ہے — پوری پوری منصوبہ بندی کی ...ں ہے۔"

"بالکل — اس کے بغیر ہم کامیاب ہو ہی نہیں سکتے تھے۔"

جلد ہی ان دونوں کو ایک غار میں لے آیا گیا۔ یہ علاقہ نیم پہاڑی ... ان پہاڑوں میں ہی ان لوگوں نے غار بھی تلاش کر رکھا تھا۔ ... غار کے منہ پر دس آدمی بالکل چوکس کھڑے رہیں — ... بھی اس طرف آنے کی کوشش کرے — گولی مار دینا — لیکن ...مارا کوئی ساتھی نہ ہو۔"

...ا کے سر — کئی آوازیں اُبھریں۔

...ہی وہ غار میں داخل ہوئے، ٹوں ٹوں کی آواز گونج

اُٹھی۔ غار میں موجود ایک بھاری بھرکم آدمی نے فوراً ایک بیگ میں سے وائرلیس سیٹ نکالا اور اسے آن کرتے ہوئے بولا:

"یس سر۔"

"کیا رہا؟"

"ٹرین پروگرام کے عین مطابق ہمارے قبضے میں ہے۔ تمام آثار مٹا دیے گئے ہیں۔ اس طرف کوئی نہیں آ سکتا۔"

"ٹرین کا کیا کیا؟"

"ابھی اس میں سے سواریاں اُتاری جا رہی ہیں۔"

"میرا مطلب ہے۔ ہیلی کاپٹروں کی مدد سے تو ٹرین کو دیکھا ہی جا سکتا ہے۔ اور ٹرین کو تلاش کرنے والی ٹیمیں پہلے اسی طرف توجہ دیں گی۔"

"جی ہاں! ہم اس کا انتظام پہلے ہی کر چکے ہیں۔ وہ سُرنگ ہمارے کام آئے گی۔"

"بہت خوب۔ اس سے پہلے کہ ہیلی کاپٹر آئیں۔ ٹرین سُرنگ میں لے جاؤ۔"

"آپ فکر نہ کریں باس۔ چند منٹ بعد ٹرین سُرنگ میں ہو گی۔"

"اور وہ دونوں۔ وہ کیا کہتے ہیں؟"

"کاغذات کے بارے میں کچھ بھی بتانے پر تیار نہیں ہیں

"مجھے پہلے ہی معلوم تھا۔ اس کام کے لیے کیپٹن ارشد اور اس کے ماتحت کا انتخاب بلا وجہ نہیں کیا گیا۔"

"ہُوں! آپ ٹھیک کہتے ہیں سر۔ یہ بھی اسی قسم کی باتیں کر رہے تھے۔ لیکن آپ فکر نہ کریں۔ ہمارا اور ان کا مقابلہ تو دراصل اب شروع ہو گا۔"

"ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ جس قدر جلد ہم کاغذات حاصل کر لیں گے۔ اسی قدر کامیابی کے امکانات زیادہ ہوں گے۔"

"ہم ابھی اور اسی وقت اپنی کوشش شروع کر رہے ہیں سر۔"

"او کے۔"

اور سلسلہ بند ہو گیا۔ بھاری بھرکم آدمی نے سیٹ بند کرتے ہوئے کہا:

"ان دونوں کے کپڑے اُتار دو۔"

دوڑنے والے

"وہ مارا — مچھلی پھنس گئی — اور ہے بھی بڑی مچھلی۔" انسپکٹر جمشید نے بلند آواز میں کہا۔

"لیکن ابّا جان — یہ آپ کس طرح کہہ سکتے ہیں۔ کہ مچھلی بڑی ہے۔" فرزانہ بولی۔

"اس کو کھینچنا میرے لیے مشکل ثابت ہو رہا ہے — چھوٹی سی مچھلی تو آسانی سے کھنچ آتی ہے۔"

"چلیے — پھر شکار کا لطف تو آ ہی جائے گا۔" محمود مسکرایا۔

"ارے — ارے — میرا خیال ہے — میرے کانٹے میں بھی مچھلی پھنس گئی ہے۔" خان رحمان چلّائے۔

"یک شد دو شد۔" فاروق نے خوش ہو کر کہا۔

"بھئی تین شد کہتے ڈر لگتا ہے کیا۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"تب — تو — کیا — آپ کے کانٹے میں بھی۔"

"ہاں بالکل — لیکن شاید وہ زیادہ بڑی نہیں ہے۔" پروفیسر

بولے —

"یہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے — جیسے — مچھلیوں نے ہمارے کانٹوں میں پھنسنے کا ایکا کر لیا ہو۔" فاروق مسکرایا۔

"لو اور سنو — اب مچھلیاں بھی ایکا کرنے لگیں۔ گویا انھیں بھی محاورے سوجھنے لگے۔" محمود نے جتا کر کہا۔

"ہائیں — یہ — یہ تو میرے قدم اکھاڑے دے رہے ہے، ارے ارے — تم — مجھے پکڑو بھئی۔" انسپکٹر جمشید ہکلائے۔

تینوں ان کی طرف دوڑے — اور ان کی کمر میں ہاتھ ڈال دیے — انسپکٹر جمشید کے اکھڑتے قدم رک گئے — آخر مچھلی نے ہمت ہار دی — اور وہ اُسے کھینچنے میں کامیاب ہو گئے — مچھلی کو دیکھ کر وہ حیران رہ گئے — وہ ایک بہت بڑا رہو تھا، اتنے میں خان رحمان اور پروفیسر داؤد بھی اپنا شکار کھینچ چکے تھے — خان رحمان نے ایک جھینگا مچھلی شکار کی تھی اور پروفیسر داؤد کے کانٹے میں لمبا سا ایک بام لگا تھا —

ابھی وہ ان کو کھینچ کر فارغ ہی ہوئے تھے کہ ایک ہیلی کاپٹر کی آواز سنائی دی — یہ کوئی ایسی عجیب بات نہیں تھی — لہٰذا وہ کیوں توجہ دیتے — لیکن جب ہیلی کاپٹر بار بار چکر کاٹنے لگا تو انھیں اس کی طرف توجہ دینی پڑی — اس وقت یک ہیلی کاپٹر بھی کافی نیچے آ چکا تھا —

"ضرور کوئی بات ہے۔" انسپکٹر جمشید بڑبڑائے اور پھر اپنے ہاتھ لہرانے لگے۔ انھوں نے بھی ہاتھ لہرانے میں ان کا ساتھ دیا۔ ہیلی کاپٹر کے پائلٹ نے ان کو ہاتھ لہراتے دیکھ لیا، وہ کچھ اور نیچے آ گیا، پھر جھک کر آواز [illegible]

[illegible]

[illegible] انسپکٹر جمشید نے منہ پر ہاتھ [illegible] آواز اوپر تک نہیں جا سکی۔

[illegible] کام نہیں چلے گا۔ میں اور نیچے آ رہا ہوں۔ اور دور بین میں دیکھتا ہوں۔" پائلٹ کی آواز ابھری۔

"ضرور دیکھ لو بھئی۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے، لیکن کاش تم کوئی کیس نہ لائے ہو۔" فاروق بولا۔

"کیس۔ اور ہیلی کاپٹر کے ذریعے۔ گھاس تو نہیں کھا گئے۔" محمود نے اسے گھورا۔

"تم نہیں جانتے محمود۔" فاروق نے خوف زدہ انداز میں کہا۔

"کیا نہیں جانتا۔"

"ہم چونکہ کسی کو بھی بتائے بغیر یہاں تک آئے ہیں۔ اس لیے ہماری تلاش میں ہیلی کاپٹر بھی اڑائے جا سکتے ہیں، اور ایسا ضرور کسی کیس کے سلسلے میں کیا جائے گا۔"

"ہوں۔ ہو سکتا ہے۔ یہی بات ہو، لیکن ایسا نظر نہیں

آتا۔"

"ہیلی کاپٹر اور نیچے ہو رہا ہے۔ جلد ہی تمھیں بھی نظر آنے لگے گا۔" فاروق نے بے چارگی کے عالم میں کہا۔

اور پھر ہیلی کاپٹر ان کے سروں پر منڈلانے لگا، پھر پائلٹ کی آواز انھوں نے سنی:

"میں نے آپ لوگوں کو پہچان لیا۔ آپ ضرور انسپکٹر جمشید ہیں۔ ملک کو فوری طور پر آپ کی ضرورت ہے۔ ایک بہت خوفناک معاملہ پیش آ گیا ہے۔ ایک طرف ہو جائیے — میں ہیلی کاپٹر کو زمین پر ٹکا رہا ہوں۔"

"بھائی۔ آپ اپنی پہچان میں دھوکا تو نہیں کھا رہے۔" فاروق نے بلند آواز میں کہا۔

"کیا مطلب؟" پائلٹ نے حیرت زدہ انداز میں پوچھا۔

"کہیں تم نے پہچاننے میں غلطی تو نہیں کی۔ تمھیں یقین ہے کہ یہ انسپکٹر جمشید ہیں۔"

"تت۔ تو اور کیا۔ اور۔ اور یہ آپ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں۔"

"بھئی باتوں کا کیا ہے۔ وہ تو کسی بھی قسم کی جا سکتی ہیں۔" فاروق بولا۔

ہیلی کاپٹر نیچے ٹک گیا۔ پائلٹ نے نیچے چھلانگ لگا

دی۔ انجن اس نے چلتا چھوڑ دیا تھا:

"آپ فوراً سوار ہو جائیں جناب۔ دیر کرنا مناسب نہیں ہوگا۔"

"اتنی جلدی کرنا بھی مناسب نہیں ہوگا۔ ہیلی کاپٹروں کے پائلٹوں میں بھی ملک دشمن لوگ ہو سکتے ہیں۔ آخر ہم آپ کی بات پر کس طرح یقین کر لیں؟"

"یہ بہت آسان ہے۔" پائلٹ مسکرایا۔

"کیا بہت آسان ہے؟"

"اعتبار کرنا۔ میں اعتبار کرا دیتا ہوں۔"

"وہ کیسے۔ یہ نسخہ تو ہم بھی جاننا چاہیں گے۔ تاکہ ہم بھی دوسروں کو اعتبار کرا دیا کریں۔" فاروق نے شوخ آواز میں کہا۔

پائلٹ نے جیب سے ٹرانسسٹر سیٹ نکالا اور اسے آن کر دیا۔ ایک منٹ بعد ہی اس پر خبر نشر ہونے لگی:

"انسپکٹر جمشید اور ان کے ساتھی جہاں کہیں بھی ہوں۔ فوراً راول گنج پہنچ جائیں۔ ایک اہم معاملہ درپیش ہے۔"

یہ اعلان بار بار دہرایا جا رہا تھا:

"ایک بات کا یقین آ گیا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"جی کیا مطلب؟"

"یہ تو ہم نے جان لیا۔ کہ ہماری ضرورت ہے، لیکن ابھی تک آپ اپنے بارے میں یقین نہیں دلا سکے۔ کہ آپ غلط آدمی تو نہیں ہیں۔"

"میں اپنے کاغذات پیش کر سکتا ہوں۔"

"درست کاغذات والے بھی غلط آدمی ثابت ہو سکتے ہیں۔" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

"تب پھر۔ آپ ہی بتا دیں۔ میں کس طرح اطمینان کراؤں آپ کا۔" اس نے اُلجھ کر کہا۔

"ہم آپ کو یہیں چھوڑے جاتے ہیں اور خود راول گنج پہنچ جاتے ہیں۔ وہاں پہنچ کر آپ کو بلوا لیا جائے گا۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ ملک اور قوم کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ دو ایک گھنٹے کا انتظار ہی کرنا ہوگا۔ لیکن۔ کیا آپ ہیلی کاپٹر اڑا لیں گے۔"

"یہ ہمارے لیے ذرا بھی مشکل نہیں۔ ہمارے یہ ساتھی ریٹائرڈ فوجی ہیں۔ اور میں بھی یہ کام کر لیتا ہوں۔"

"اوہ اچھا۔ ٹھیک ہے۔ آپ تشریف لے جائیے۔"

"ایک دوسری ترکیب بھی ہے۔ اس پر عمل کر کے یہ انتظار سے بچ سکتے ہیں اور ان کے لیے ہیلی کاپٹر بھی نہیں بھیجنا پڑے گا۔" فرزانہ بول اٹھی۔

" وہ کیا؟"

" یہ کہ ہم انھیں بھی ساتھ لے چلیں۔ ہیلی کاپٹر انکل خان رحمان اڑائیں۔ اور ہم انھیں پستول کی زد میں لیے رہیں۔"

" یہ پہلی والی ترکیب سے بہتر رہے گی۔" انسپکٹر جمشید بولے۔ اور اس ترکیب پر عمل کر کے وہ ہیلی کاپٹر میں روانہ ہو گئے:

" اور اب مسٹر پائلٹ۔ یہ بھی بتانا شروع کر دیں کہ معاملہ کیا ہے۔ تاکہ ہم اترتے ہی کام شروع کر سکیں۔"

" ایک ٹرین کو اغوا کر لیا گیا ہے۔"

" کیا کہا۔" وہ چلائے۔

" جی ہاں۔ پوری ٹرین غائب ہے۔ لیکن اہم مسئلہ یہ ہے کہ اس ٹرین میں اہم فوجی نوعیت کے کاغذات راول گنج لائے جا رہے تھے۔"

" گویا وہ کاغذات بھی ساتھ غائب ہیں۔"

" جی ہاں! اور اغوا کرنے والوں نے پانچ کروڑ کا مطالبہ کیا ہے۔"

" کک۔ کیا مطلب؟" وہ چونکے۔

" اس کا کہنا ہے کہ پانچ کروڑ اسے دے کر ہم ٹرین اور اس کے مسافر حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن صرف چار گھنٹے

کے نوٹس پر۔ چار گھنٹے کے بعد وہ ان کاغذات کا سودا شارجستان سے کر سکتا ہے۔"

" اوہ نہیں۔" انسپکٹر جمشید نے خوف زدہ انداز میں کہا۔

" جی ہاں! بالکل یہی بات ہے۔"

" تو وہ پہلے ہی کیوں شارجستان سے سودا نہیں کر لیتا۔" انسپکٹر جمشید نے منہ بنایا۔

" اس لیے کہ کاغذات ابھی اس کے ہاتھ نہیں لگے۔ ابھی تو اس نے صرف ٹرین پر قبضہ کیا ہے۔"

" کک۔ کیا مطلب؟" وہ چونک اٹھے۔

" جی ہاں! بات یہ ہے کہ کاغذات کیپٹن ارشد اور ان کے اسسٹنٹ لا رہے تھے۔ یہ دونوں محب وطن ہیں۔ اور کاغذات کے معاملے میں بہت محتاط بھی ہیں۔ انھوں نے کاغذات نہ جانے کہاں رکھے ہوئے ہیں۔ پتا نہیں ٹرین میں کسی جگہ۔ یا اپنے سامان میں۔ یا اپنے جسم کے ساتھ کسی جگہ۔ دشمنوں کو یہ بات معلوم نہیں۔"

" شکریہ مسٹر۔ آپ کا نام کیا ہے؟" انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔

" کیپٹن سرگم۔"

" مسٹر کیپٹن سرگم۔ آپ میری ایک بات مانیں گے؟"

"جی فرمایئے۔" اس نے فوراً کہا۔

"ہیلی کاپٹر سے نیچے چھلانگ لگا دیں۔"

"جی۔ کیا مطلب؟" وہ زور سے چونکا۔

"یہ تمہاری قسمت ہے۔ کہ زندہ رہتے ہو یا مرتے ہو۔ میں تمہیں اس وقت یہی سزا دے رہا ہوں۔"

"جی۔ میں سمجھا نہیں۔"

"سمجھے تو ہم بھی نہیں بڑے بھائی۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"مجھے اس بات کا یقین ہو چکا ہے کہ تم ایک غلط آدمی ہو۔ غدار ہو۔ اور تمہارے ذمے یہی کام لگایا گیا تھا کہ دوسرے ہیلی کاپٹر جب ٹرین کی تلاش میں اڑیں تو تم ٹرین کی بجائے ہماری تلاش میں نکل جانا، تاکہ ہم ٹرین والے معاملے کی طرف توجہ نہ دے سکیں۔ لیکن ہم تمہارے جال میں نہیں آئے اور پائلٹ سیٹ خود سنبھال لی۔ ورنہ تم ہمیں اس وقت راول گنج کی بجائے کہیں اور لے جا رہے ہوتے۔"

"اوہ۔ نہیں۔" محمود، فاروق اور فرزانہ کے منہ سے نکلا۔

پروفیسر داؤد اور خان رحمان بھی دھک سے رہ گئے۔

"ل۔ لیکن۔ آپ۔ آپ نے یہ اندازہ کس طرح لگایا کہ میں غدار ہوں؟" سرگم نے کانپتی آواز میں کہا۔

"میں شروع سے ہی تمہارا بغور جائزہ لے رہا ہوں۔ تمہاری آنکھوں میں بے چینی کم ہونے کی بجائے برابر بڑھ رہی ہے۔ جب کہ وطن کے ہمدرد ہونے کی صورت میں ہمیں پا کر تو تمہاری ساری بے چینی دور ہو جانی چاہیے تھی۔"

"ہوں۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ میں شادجستان کا جاسوس ہوں اور اس وقت بھی آپ سب کی زندگیاں میرے ہاتھ میں ہیں۔" اس نے بے فکری کے عالم میں کہا۔

"کیا مطلب؟" وہ چونکے۔

"ہاں! میرے جسم کے ساتھ ایک بم بندھا ہے۔ ایک خاص قسم کی حرکت اس بم کو پھاڑ دے گی اور ساتھ ہی یہ ہیلی کاپٹر بھی ٹکڑوں میں تبدیل ہو جائے گا۔"

"اور ساتھ ہی تم بھی مسٹر سرگم۔" خان رحمان نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"ہاں! میں بھی۔ لیکن مجھے اس کی ذرا بھی پروا نہیں، کیونکہ میں اپنے وطن کے لیے جان دینے کے لیے بے چین

اس نے فخریہ لہجے میں کہا۔

"اگر آپ بے چین ہیں تو پھر آنکھوں میں اُلجھن کیوں ہے؟"

"موت سے پہلے کچھ نہ کچھ اُلجھن تو ضرور ہوتی ہے۔ آخر میں بھی انسان ہوں۔"

"لیکن تم ایک بات بھول گئے مسٹر سرگم۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"اور وہ کیا؟" اس نے جلدی سے کہا۔

"یہ کہ تمھارا مقابلہ عام انسانوں سے نہیں۔ ہم تمھیں وہ خاص حرکت کرنے کے قابل ہی کب رہنے دیں گے۔"

انسپکٹر جمشید نے ان الفاظ کے ساتھ ہی اپنا پستول اس کے سر پر پوری قوت سے دے مارا۔ اس کا سر ڈھلک گیا:

"محمود۔ باقی کام تم کرو۔"

وہ اُٹھا اور اس کی کمر پر بندھا بم اُتار لیا۔ اس پر ایک نظر ڈالی اور پھر پروفیسر کی طرف بڑھا دیا۔ انھوں نے اس کی ایک پن نکال لی اور بولے:

"اب یہ نہیں پھٹے گا۔ ویسے جمشید۔ تم نے اسے پکڑا خوب۔"

اور ان کا ہیلی کاپٹر نیچے اترنے لگا۔ راول گنج کے لوگوں کی نظریں اترنے والے ہیلی کاپٹر پر جم کر رہ گئیں، کیونکہ یہ پہلا ہیلی کاپٹر تھا۔ جو واپس آیا تھا۔ ٹرین کی

...ن میں نکلنے والے ہیلی کاپٹر ابھی تک واپس نہیں آئے ... آتے بھی کیسے۔ جب کہ ٹرین کا انھیں نام و نشان ... نظر نہیں آیا تھا۔ پھر جونہی وہ زمین پر اترے۔ ... لوگ ان کی طرف دوڑ پڑے۔

دوڑنے والوں میں آئی جی صاحب بھی تھے۔

بند کارخانہ

"تو سرگم نے کارنامہ انجام دے ہی دیا۔ اس نے تم لوگوں کو تلاش کر ہی لیا۔" آئی جی بولے۔

"جی ہاں ۔ بے چارہ سرگم۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"بے چارہ سرگم ۔ کک ۔ کیا وہ کسی حادثے کا شکار ہو گیا ہے؟"

"وہ زخمی حالت میں اوپر موجود ہے۔"

"اوہو اچھا ۔ لیکن اسے ہوا کیا؟"

"میں نے اس کے سر پر پستول دے مارا۔ بس بے چارہ بے ہوش ہوگیا۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"کیا مطلب؟"

اب انسپکٹر جمشید نے تفصیل کہ سنائی۔ ان کی حیرت کا کیا پوچھنا:

"اب آپ سنایئے ۔ اس نے جو ہمیں ٹرین کی کہانی سنائی

ہے۔ کیا وہ سچ ہے؟"

"ہاں! ٹرین کو واقعی اغوا کر لیا گیا ہے۔ اس میں بہت اہم کاغذات لائے جا رہے تھے۔"

"ہوں ۔ میں پوری تفصیل جاننا چاہتا ہوں۔"

"ملٹری آفس جانا ہوگا جمشید۔"

"چلیے پھر۔" انھوں نے کندھے اُچکائے۔

پندرہ منٹ بعد وہ ملٹری آفس میں موجود تھے۔ پوری تفصیل انھیں بتائی گئی۔ آخر انسپکٹر جمشید بولے:

"مون پور اور راول گنج کے درمیانی علاقے کا نقشہ مل سکتا ہے؟"

"نقشے میں صرف ریلوے لائن دکھائی گئی ہے۔ درمیانی علاقہ بالکل بنجر ہے۔ غیر آباد بھی ہے۔"

"ایک بات تو صاف ہے۔ اس کام میں ریلوے کے کچھ ماہرین سے کام لیا گیا ہے۔ اب یہ نہیں معلوم کہ وہ ریلوے کے ملازم ہیں۔ یا ان لوگوں نے اپنے طور پر کچھ ماہرین کا انتظام کیا تھا۔ خیر۔ پہلے یہ بتائیں۔ کاغذات کہاں سے لائے جا رہے تھے؟"

"سب ہیڈ کوارٹر سے۔" کمانڈر انچیف بولے۔

"کیا ۔ ان کاغذات کو وہاں سے لانے کا پروگرام پہلے سے

تھا۔"

"ہاں! دراصل یہ کاغذات ایک فوجی منصوبے کے متعلق ہیں، سب آفس کے ماہرین نے اس منصوبے کو ترتیب دیا ہے، اس پر مزید غور کے لیے کاغذات کو راول گنج ہیڈ کوارٹر لانا پڑا۔ اس کام کے لیے باقاعدہ ایک دن مقرر کیا گیا۔ ظاہر ہے۔ اس کی اطلاع کچھ لوگوں کو تو رہی ہی ہو گی۔"

"یہ کام غداروں کے ذریعے لیا گیا ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ہاں۔ یہ تو خیر ہے۔"

"میں فوری طور پر مون پور جانا پسند کروں گا۔ میری تفتیش وہاں سے شروع ہو گی۔"

ان کو مون پور پہنچانے کا فوری انتظام کیا گیا۔ آدھ گھنٹے بعد وہ سٹیشن پر موجود تھے۔

"سب سے پہلے میں مون پور کے سٹیشن ماسٹر سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"وہ تو ٹرین کی تلاش میں گئے ہوئے ہیں جناب۔" ایک ملازم نے جواب دیا۔

"تو کیا ریلوے ملازم بھی اس کام میں مصروف ہیں؟"

"جی ہاں! آخر ذمے داری تو ان پر بھی عاید ہوتی ہے۔"

"اچھا یہاں سے راول گنج تک راستے میں کیا کچھ آتا

ہے۔"

"ایک سرنگ۔ تین پھاٹک، دو پل اور ک[illegible]"

"ہوں۔ آپ کے سٹیشن ماسٹر گئے تو اسی [illegible]"

"جی ہاں! جتنے لوگ بھی گئے ہیں۔ اسی طر[illegible] جا بھی کس طرف سکتے ہیں۔"

"ان کا نام کیا ہے؟"

"جی۔ شریف خالد۔"

"شکریہ۔ آئیں بھئی۔ ہم بھی اسی طرف چلتے ہیں۔ یہاں رہ کر تو کچھ بھی نہیں ہو گا۔"

وہ جیپ میں وہاں سے راول گنج کی طرف بڑھنے لگے۔ ریلوے لائن کے دو ماہر انھوں نے ساتھ لے لیے تھے۔ روانہ ہوتے ہی انسپکٹر نے ان سے کہا:

"جس جگہ سے بھی لائن بدل جانے کا امکان نظر آئے، مجھے بتا دیں۔"

"جی اچھا۔" دونوں نے ایک ساتھ کہا۔

"جہاں تک میرا خیال ہے۔ ٹرین کو اغوا کرنے کے لیے [illegible] لائن بچھائی گئی ہے۔ لیکن یہ کام آسان نہیں۔ اور ایک [illegible] دن کا بھی نہیں۔ ایسی سرگرمیاں چھپی بھی نہیں رہتیں۔ کیا [illegible]ال ہے آپ دونوں کا؟" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔"

"لیکن۔ اس کے باوجود ٹرین غائب ہے۔ آخر کیسے؟"

"اس پر تو سب حیران ہیں۔"

"ہوں!" انھوں نے کہا اور گہری سوچ میں گم ہو گئے۔ پھر وہ ان سے بولے:

"آپ لوگوں کا کیا خیال ہے بھئی؟"

"کم از کم میری عقل تو جواب نہیں دے رہی۔" پروفیسر بولے۔

"اور میں بھی دم بخود ہوں۔" خان رحمان نے کہا۔

"جب کہ میرے ذہن میں ایک بات آ رہی ہے۔" فرزانہ مسکرائی۔

"بہت خوب فرزانہ۔ جلدی بتاؤ۔"

"ہم سب کے سب۔ یعنی ریلوے کے ملازم اور دوسرے لوگ بھی صرف اور صرف ایک بات سوچ رہے ہیں۔ اور وہ یہ کہ ٹرین کو کسی نا معلوم مقام پر لے جایا گیا ہے۔"

"ہاں بالکل۔ سوچنا بھی یہی چاہیے۔" محمود نے فوراً کہا۔

"نہیں محمود۔ فرزانہ کے خیال کے مطابق ایسا ہرگز نہیں سوچنا چاہیے۔" فاروق مسکرایا۔

"کک۔ کیا مطلب۔ فرزانہ کیا تم اس بات کے علاوہ کوئی

اور بات کہنا چاہتی ہو۔"

"ہاں! اس لیے کہ یہ بات تو سبھی کر رہے ہیں۔ میرے کہنے کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔"

"گویا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ ٹرین کو کسی نا معلوم جگہ پر نہیں لے جایا گیا۔" فاروق بولا۔

"ہاں بالکل۔ دونوں سٹیشنوں کے درمیان جتنی بھی لائنیں ادھر اُدھر نکلتی ہیں۔ ان سب کو چیک کر لیں۔ کسی ایک لائن پر ٹرین کھڑی مل جائے گی۔"

"بہت خوب فرزانہ۔ تم نے میرے سر سے بہت بڑا بوجھ اتار دیا۔ یہی میں سوچ رہا تھا۔ کہ ٹرین اتنی آسانی سے کس طرح غائب ہو سکتی ہے۔ صاف ظاہر ہے۔ کسی ایسی جگہ جہاں پہلے ہی ریلوے لائن جا رہی ہے۔ ٹرین کو لے جانا بالکل بھی مشکل نہیں۔ اور اب ہم اپنے دونوں ساتھیوں سے پوچھیں گے کہ اس لائن پر دائیں بائیں کہاں کہاں لائنیں مڑتی ہیں؟"

"پچیس کلو میٹر کے فاصلے پر لوہے کا ایک بہت بڑا کارخانہ ہے۔ اس کارخانے میں مال ریل کے ذریعے لے جایا جاتا ہے، اس لیے ایک لائن اس کارخانے تک چلی گئی ہے۔ دوسرے ایک اور مل ہے۔ وہاں کپڑا تیار ہوتا ہے۔ وہاں

بھی سامان اور مشینری ریل کے ذریعے لے جائی جاتی ہے۔ ایک بہت بڑا کارخانہ اور بھی ہے، لیکن اب وہ بند ہو چکا ہے۔"

"اوہو اچھا۔" انسپکٹر جمشید چونک اُٹھے۔

"جی ہاں! اس تک بھی ریلوے لائن جاتی ہے۔"

"تب پھر ہمیں سب سے پہلے اس کارخانے کو دیکھنا چاہیے، ٹرین ضرور وہیں ہے۔"

"چلتے رہیے۔ میں راستا بتا دوں گا۔"

"ان تین جگھوں کے علاوہ کسی اور طرف بھی ریلوے لائن لے جائی گئی ہے۔"

"جی۔ جی نہیں۔ ہمارے علم میں تو یہی تین لائنیں ہیں۔ وہ دیکھیے، یہاں سے دائیں طرف وہ لائن مڑ رہی ہے۔"

"ہاں۔ کیا یہ اسی بند کارخانے کی ہے؟"

"جی ہاں!"

انھوں نے جیپ کا رُخ موڑ دیا۔ اب ان کے دل دھڑکنے لگے تھے۔ ایسے میں خان رحمان نے کہا:

"جمشید۔ اس طرح اندھا دھند اس طرف بڑھنا خطرناک ہو گا۔ ٹرین کو ایک دو آدمیوں نے تو اغوا کیا نہیں ہو گا۔ وہ بہت سے آدمی ہوں گے۔"

"ہوں۔ لیکن اب مدد ساتھ لانے کا ہمارے پاس وقت

نہیں ہے خان رحمان۔ دیکھا جائے گا۔"

وہ بند کارخانے کے دروازے تک پہنچ گئے، لیکن جیپ سے اُترتے ہی انھیں ٹھٹک کر رک جانا پڑا۔ ان کے سامنے ایک انسانی لاش پڑی تھی۔ اس کے سینے میں خنجر دستے تک پیوست تھا۔ اور خُون دُور تک پھیل گیا تھا۔ کُھلی آنکھوں سے حسرت ٹپک رہی تھی۔ ان کے منہ ریلوے کے دونوں مُلازموں کی طرف گھوم گئے۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے لاش کو دیکھ رہے تھے۔

"کیوں بھئی۔ کیا تم اسے پہچانتے ہو؟"

"ج۔ جی ہاں۔ یہ مسٹر شریف خالد ہیں۔ مُون پور کے سٹیشن ماسٹر۔"

"اوہ۔ یہ تو ٹرین کی تلاش میں نکلے تھے۔" فاروق چونکا۔

"جی ہاں! لیکن۔ یہ ان کے ساتھ کیا ہو گیا؟"

"دو ہی باتیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو یہ اس سازش میں شریک تھے اور معاملے کو راز رکھنے کے لیے انھیں خاموش کر دیا گیا۔ یا پھر انھوں نے ٹرین کا کوئی سُراغ لگا لیا تھا۔ دشمنوں کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو انھوں نے انھیں ختم کر دیا۔" انسپکٹر جمشید نے رائے ظاہر کی۔

"ہوں! قتل اسی جگہ کیا گیا ہے۔ خُون سے یہی ظاہر ہے۔ اس کا مطلب ہے۔ ہمیں اس بند کارخانے کا جائزہ لینا ہو گا۔"

محمود نے پُر جوش انداز میں کہا۔

کارخانے کا گیٹ زنگ آلود ہو چکا تھا۔ وہ کُھلا تھا۔

"پتا نہیں۔ کیا بات ہے جمشید۔ مَیں خوف محسوس کر رہا ہُوں۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"کیا آپ محسوس کر رہے ہیں کہ دشمن بھی آس پاس کہیں موجود ہیں۔" خان رحمان بولے۔

"یہ میں نہیں جانتا۔ بس خطرہ محسوس کر رہا ہوں۔" وُہ بڑبڑائے۔

"خان رحمان۔ پوری طرح چوکس رہو۔ اور تم تینوں بھی۔"

"اچھی بات ہے۔" وُہ ایک ساتھ بولے۔

"پہلے صرف میں اندر داخل ہوں گا۔ اگر اندر کوئی خطرہ نہ ہوا تو پھر آپ لوگ بھی آ سکتے ہیں۔"

انھوں نے کچھ نہ کہا اور انسپکٹر جمشید اندر داخل ہو گئے۔

اچانک انھوں نے ان کی آواز سُنی:

"ریل کی پٹڑی اندر تک چلی گئی ہے۔"

"اس کا مطلب ہے۔ ہم اندر آ سکتے ہیں۔"

"ہاں! میدان صاف ہے۔ یہاں کوئی نہیں ہے۔"

وُہ اندر داخل ہو گئے۔ اندر ہر طرف ویرانی تھی۔ بے کار چیزیں اِدھر اُدھر بکھری پڑی تھیں۔ وُہ ریل کی پٹڑی کے

ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

"مجھے۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جمشید۔ جیسے دو آنکھیں ہمیں گھور رہی ہیں۔" پروفیسر داؤد بڑبڑائے۔

"آپ کو آج وہم تو نہیں ہو گیا۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"وہم اور مجھے۔ کیا کہہ رہے ہو جمشید۔ میں تو وہم کو پاس بھی نہیں پھٹکنے دیتا۔"

"تب پھر۔ اس بات کا احساس ہم میں سے کسی کو کیوں نہیں ہوا۔" وُہ بولے۔

"بھلا مَیں کیا کہہ سکتا ہُوں۔" وُہ بولے۔

"خیر۔ آپ فکر نہ کریں۔ اگر یہاں کوئی چھپا ہوا ہے تو وُہ ہم پر وار کرنے کی جرأت نہیں کر سکے گا۔ اس نے ایسا کیا تو منہ کی کھائے گا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"اللہ کرے ایسا ہی ہو۔" پروفیسر داؤد نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

پٹڑی کے ساتھ ساتھ چلتے وُہ اس کے آخری سرے تک آ گئے۔ یہاں پٹڑی کو اوپر اٹھا دیا گیا تھا۔ گویا گاڑی اس سے آگے نہیں جا سکتی تھی۔

"کم از کم اس لائن پر تو گاڑی موجود نہیں ہے۔" فاروق نے بتایا۔

"ہاں! اس کا مطلب ہے ـ ہمیں لوہے کے کارخانے اور کپڑے کی مل کا بھی جائزہ لینا ہوگا۔"

"چلیے پھر ـ چلے چلتے ہیں۔" محمود نے اکتائی ہوئی آواز میں کہا۔

"کیا تمھاری دل چسپی اس معاملے سے ختم ہوتی جا رہی ہے۔" فرزانہ کے لہجے میں حیرت تھی ـ

"ایسی کوئی بات نہیں ـ بات ہے تو صرف اتنی کہ ابھی تک ہم کوئی خاص بات معلوم نہیں کر سکے۔"

"بھئی کم از کم شریف خالد کی لاش تو ہم نے تلاش کر ہی لی ـ جب کہ ابھی سٹیشن پر کسی کو یہ بات معلوم نہیں ہے۔" وہ مسکرائے ـ

"اوہو ـ یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔" انھوں نے محمود کی حیرت زدہ آواز سنی ـ سب نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا اور پھر ان کے چہروں پر حیرت دوڑ گئی ـ

جڑ کا آدمی

ان کے سامنے لوہے کے بڑے بڑے اوزار پڑے تھے ـ یہ اوزار نٹ بولٹ وغیرہ کسنے یا کھولنے کے تھے ـ

"اوزار بالکل نئے ہیں ـ لہٰذا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کارخانے کے مالکان کے ہوں گے اور اس وقت سے یہاں پڑے ہوں گے جب سے کارخانہ بند ہے۔" انسپکٹر جمشید جلدی جلدی بولے ـ

"یہ تو خیر ٹھیک ہے ـ لیکن یہاں ان اوزاروں کا کیا کام؟" فاروق بولا ـ

"ریل کی پٹڑی بچھانے کے لیے ایسے ہی اوزاروں کی ضرورت ہوتی ہے ـ یا پٹڑی اکھاڑنے کے کام بھی آ سکتے ہیں ـ لیکن ـ سوال یہ ہے کہ ٹرین تو یہاں ہے ہی نہیں۔"

"ٹرین کو تو شاید آسمان نگل گیا ہے ـ یا پھر زمین کھا گئی ہے۔" فرزانہ نے جل کر کہا ـ

"میرا خیال ہے ـ دونوں کو کوئی ضرورت نہیں تھی۔" فاروق

مسکرایا —

"کن دونوں کو ضرورت نہیں تھی اور کس چیز کی؟" فرزانہ جھنّا کر اس کی طرف پلٹی —

"زمین اور آسمان کی بات کر رہا ہوں — ان کو بھلا کیا ضرورت تھی ٹرین کو کھانے یا نگلنے کی۔" وہ مسکرایا۔

"دھت تیرے کی — تمہیں ایسے میں بھی مذاق کی سوجھ رہی ہے۔" محمود نے جھلّا کر اپنی ران پر ہاتھ مارا —

انھوں نے اِدھر اُدھر بغور دیکھا، لیکن ٹرین کے آثار دُور دُور تک نظر نہ آ سکے — پھر کارخانے سے باہر نکل کر اس کے ارد گرد کا چکر لگایا — یہ ایک نیم پہاڑی علاقہ تھا — کارخانے کے دائیں بائیں — پہاڑی سلسلہ موجود تھا — انھوں نے پہاڑوں کو بھی ایک نظر دیکھ لینے کا فیصلہ کیا — کارخانے کی پچھلی دیوار گری پڑی تھی —

"ان اوزاروں پر سے اُنگلیوں کے نشانات اُٹھانا ہوں گے — ٹرین یہاں تک آئی ہے یا نہیں — یہ اوزار ضرور لائے گئے ہیں اور خالد شریف کو بھی ہلاک کیا گیا ہے — ہو سکتا ہے ہمیں اُنگلیوں کے نشانات مل جائیں۔"

"لیکن ابّا جان — اب ہم یہاں فنگر پرنٹ کے ماہر کہاں سے لائیں۔"

"ہم ان اوزاروں کو تو بحفاظت اپنے ساتھ لے جا سکتے ہیں۔" وہ مسکرائے۔

"اوہ — اتنے وزنی اوزاروں کو۔" فاروق نے گھبرا کر کہا۔

"بھئی مل جل کر اُٹھا لیں گے — فکر کی کیا بات ہے۔" فرزانہ مسکرائی —

"دُور سے کسی نے دیکھ لیا تو لوہار خیال کرے گا۔" فاروق نے اسے گھورا۔

"تو کر لینے دو — ہمارا کیا جاتا ہے۔"

"تم لوگ بھول رہے ہو — ہمیں یہ سامان صرف جیپ تک اٹھا کر لے جانا پڑے گا۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

اچانک خان رحمان نے دوڑ لگا دی — وہ چونک کر ان کی طرف پلٹے — خان رحمان سرپٹ دوڑے جا رہے تھے:

"یہ — انھیں کیا ہوا؟" محمود نے کہا۔

اور پھر وہ بھی ان کی طرف دوڑنے لگے — کارخانہ بہت طویل و عریض تھا — دوڑتے دوڑتے وہ اس کی پچھلی دیوار تک پہنچ گئے — خان رحمان اس جگہ کھڑے بے بسی کے عالم میں اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے —

"بہت بہت شکریہ انکل۔" فاروق نے خوش ہو کر کہا۔

"لیکن — کک — کس بات کا؟" خان رحمان ہکلائے —

"بیٹھے بٹھائے دوڑ لگوا دی۔" فاروق بولا۔

"لیکن ہم بیٹھے ہوئے کب تھے؟" فرزانہ نے منہ بنایا۔

"بیٹھے بٹھائے محاورہ ہے۔"

"ایک تو یہ محاورے ہر جگہ کود پڑتے ہیں۔"

"خان رحمان ۔ تم نے بتایا نہیں۔ دوڑنے کی ایسی کیا ضرورت پڑ گئی تھی۔"

"میں نے اس جگہ ایک سایہ سا دیکھا تھا۔"

"تمہارا مطلب ہے۔ کوئی یہاں تھا۔" پروفیسر داؤد جلدی سے بولے۔

"ہاں! مجھے وہم نہیں ہوا تھا۔ میں نے واقعی سایہ دیکھا تھا۔"

"اور پروفیسر صاحب بھی یہی خیال کرتے رہے ہیں۔ کہ کوئی انہیں گھور رہا تھا۔ تب تو ہمیں۔ غور کرنا ہوگا۔ پہلی بات تو یہ کہ ایک عدد لاش ہمیں مل چکی ہے۔ دوسرے وہ اوزار، اور تیسرے یہ سایہ۔ آخر یہ سب کیا ہے۔" انسپکٹر جمشید جلدی جلدی بولے۔

"بھول بھلیاں۔ کیونکہ جس چیز کی تلاش میں ہم نکلے ہیں۔ اس کا دور دور تک پتا نہیں۔ وہ اس طرح غائب ہے، جس طرح گدھے کے سر سے سینگ۔" فرزانہ نے کہا۔

"گگ ۔ کون؟" پروفیسر داؤد نے بے خیالی کے عالم میں کہا۔

"ٹٹ ۔ ٹرین۔" فاروق بولا۔

"لیکن ہم ٹٹ ٹرین کی نہیں ۔ صرف ٹرین کی تلاش میں ہیں۔" محمود نے جل کر کہا۔

"جلنے بھننے سے تو وہ ٹرین مل نہیں جائے گی۔"

"اوہ جمشید۔ یہ بھی خیال رہے ۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے ۔ مجرموں نے صرف چار گھنٹے کی مہلت دی ہے غور کے لیے ۔ وہ بھی شاید اس لیے کہ ابھی کاغذات خود اس کے سمجھنے میں نہیں آئے۔"

"اور ادھر کیپٹن ارشد اور اس کا ماتحت راشد مصیبت میں ہوں گے ۔ مجرم ان پر پورا زور صرف کر رہے ہوں گے۔" پروفیسر داؤد نے کانپ کر کہا۔

"ہاں! لیکن کیا کیا جا سکتا ہے ۔ ہم اپنی پوری کوشش کر رہے ہیں کہ جلد از جلد ٹرین کا سراغ مل جائے۔"

"اب سب کچھ بھول کر ہمیں اس سائے کا سراغ لگانا ہوگا ۔ یہ دیوار بہت اونچی ہے۔ وہ اس پر تو چڑھ نہیں سکتا تھا کہ ہم خیال کریں ۔ دوسری طرف پھلانگ گیا ہوگا۔ لہٰذا وہ ضرور یہیں کہیں دبکا ہوا ہوگا ۔ اور جہاں تک میرا خیال ہے ۔ وہی قاتل ہے۔ ہمارے یہاں آنے سے

بہرحال وہ بجلی اس نے یہ خوفناک کام کیا ہے۔ وہ شاید یہ اوزار اٹھا کر لے جا رہا تھا کہ شریف خالد یہاں پہنچ گیا۔ لہٰذا اس نے شریف خالد کو ختم کر دیا۔ لیکن اسی وقت اس نے ہماری جیپ آتے دیکھ لی۔ اور اسے کارخانے کے اندر چھپ جانا پڑا۔ اور اس کا مطلب ہے۔ پروفیسر صاحب کی چھٹی حس انھیں غلط خبر نہیں دے رہی تھی۔" اتنا کہہ کر انھوں نے ایک نظر چاروں طرف ڈالی، پھر بلند آواز میں بولے:

"میرے دوست۔ تم جہاں کہیں بھی ہو۔ سامنے آجاؤ۔ اب تم بچ نہیں سکتے۔ ہم تمھیں تلاش کر کے رہیں گے۔"

ان الفاظ کے بعد بھی کوئی سامنے نہ آیا۔ انھوں نے چند سیکنڈ انتظار کیا اور پھر ایک سمت میں چل پڑے۔ اس طرف ایک بڑا سا کمرہ تھا۔ جس کا بڑا دروازہ غائب تھا۔ بس دیواریں کھڑی تھیں۔ انسپکٹر جمشید بے دھڑک اندر داخل ہو گئے۔ یہاں بے کار لوہے کا ایک بڑا ڈھیر موجود تھا۔ انھوں نے اس ڈھیر کے گرد چکر لگایا، پھر بولے:

"میں نے تمھیں دیکھ لیا ہے۔ باہر نکل آؤ۔"

"آپ نے دیکھ لیا ہے۔ لیکن ہمیں تو وہ نظر نہیں آیا۔" فاروق نے حیران ہو کر کہا۔

"ادھر آ کر دیکھو۔ لوہے کے اس ڈھیر میں ایک راستہ سا بنا ہوا ہے۔ اور اس کے اندر جا کر ایک خلا سا موجود ہے، وہ اس خلا میں اکڑا ہوا ہے۔"

"بھئی واہ۔ کمال کی جگہ تلاش کی ہے اس نے۔" خان رحمان مسکرائے۔

آخر انھوں نے اسے نکلتے دیکھ لیا۔ اس کے ہاتھ میں لوہے کی ایک تلوار نما سلاخ تھی۔ اس سلاخ کو اس نے دونوں ہاتھوں سے پکڑ رکھا تھا۔ خلا میں سے باہر نکلتے ہی اس نے سلاخ کو تلوار کی طرح سونت لیا:

"خبردار۔ میرے نزدیک آنے کی کوشش نہ کرنا۔"

"دیکھو بھئی۔ بُری بات ہے۔" فاروق نے گھبرا کر کہا۔

"کون سی بات بُری ہے؟"

"یہ تلوار بازی۔ اب تلوار چلانے کے زمانے کہاں رہے۔ ہمارے پاس یوں بھی پستول موجود ہیں۔ تمھاری یہ تلوار دھری کی دھری رہ جائے گی۔ لہٰذا اسے ہاتھ سے گرا دو۔ اور دوستانہ ماحول میں بتاؤ۔ کہ کیا چکر ہے۔"

"میں نہیں جانتا۔ کیا چکر ہے۔ میں تو اس طرف سے گزر رہا تھا۔ دروازے پر میں نے لاش پڑی دیکھی تو گھبرا گیا۔ اسی وقت میں نے آپ لوگوں کی جیپ دیکھ لی۔ میں نے سوچا کہیں آپ مجھے قاتل نہ خیال کریں، اس لیے کارخانے میں

گھس گیا۔"

"ارے بس۔ اتنی سی بات تھی۔" فاروق نے چہک کر کہا۔

"ہاں۔ بس۔ بالکل یہی بات ہے۔" وہ بولا۔

"تب تو آپ بالکل بے گناہ ہوئے۔ اب ذرا یہ بتائیے کہ آپ یہاں سے گزر کیوں رہے تھے۔" فاروق نے کہا۔

"کک۔ کیوں گزر رہا تھا۔ کیا مطلب۔ کیا یہاں سے گزرنا منع ہے۔"

"نہیں۔ اس قسم کا کوئی بورڈ ہم نے یہاں لگا ہوا نہیں دیکھا۔ لیکن سوال تو یہ ہے کہ آپ کو یہاں سے گزرنے کی کیا ضرورت پیش آ گئی۔ کیا آپ یہاں آس پاس رہتے ہیں؟"

"اوہ ہاں۔ بالکل بالکل۔ میں یہیں رہتا ہوں تھوڑے فاصلے پر۔"

"تو پھر چلیے۔" فاروق بولا۔

"کک۔ کہاں چلوں؟"

"اپنے گھر تک۔ ہم بھی آپ کا گھر دیکھنا چاہتے ہیں۔"

"آپ۔ آپ بھی عجیب آدمی ہیں۔" اس نے گڑبڑا کر کہا۔

"اس میں عجیب بات کیا ہو گی۔ بڑے کو اس کے گھر تک پہنچانا ہی چاہیے۔" فاروق مسکرایا۔

"فاروق تم وقت ضائع کر رہے ہو۔ جب کہ ہم بہت جلدی میں ہیں۔ اے مسٹر یہ سلاخ گرا دو۔ ورنہ میں تمہارے ہاتھ میں ایک عدد سوراخ کر دوں گا۔" انسپکٹر جمشید نے غرّا کر کہا۔

اس نے سلاخ گرانے کی بجائے تلوار کے انداز میں اسے گھمانا شروع کر دیا۔ اور ان کی طرف بڑھا:

"بھئی واہ۔ یہ تو اچھا بھلا تلوار باز ہے۔ اب اس سے میں بھی تلوار بازی کروں گا۔" انسپکٹر جمشید نے ہنس کر کہا۔ اور جھک کر ایک سلاخ اٹھا لی۔ انھوں نے بھی سلاخ کو تلوار کے انداز میں پکڑا اور اسے گھماتے ہوئے آگے بڑھے۔ یہ دیکھ کر اس کے چہرے پر قدرے خوف کے آثار نمودار ہو گئے، لیکن پھر وہ پُر جوش انداز میں ان کی طرف بڑھا۔ دونوں سلاخیں آپس میں ٹکرائیں۔ ان کے ٹکرانے سے آواز پیدا ہوئی۔

"بھئی واہ۔ پرانے زمانے کی جنگوں کی یاد تازہ ہو گئی۔" فاروق نے خوش ہو کر کہا۔

اچانک انسپکٹر جمشید نے ہاتھ بلند کیا اور سلاخ پر زور سے سلاخ ماری۔ اس کے ہاتھ سے سلاخ گر گئی:

"ہاتھ اوپر اٹھا دو مسٹر۔ ورنہ میری تلوار تمہارے سینے کے پار ہو گی۔" انسپکٹر جمشید نے فلمی اداکاروں کے انداز میں کہا اور وہ مسکرا دیے۔ اس نے ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔

"ہاں! اب اسی حالت میں بتاؤ۔ تمھارا نام کیا ہے؟"

"میں راجر ہوں۔"

"چلو اچھا ہوا تم راجر ہو۔ گاجر نہیں ہو۔" فاروق نے منہ بنا کر کہا۔

"تم چپ رہو۔" انسپکٹر جمشید بگڑ کر اس کی طرف پلٹے، پھر راجر سے بولے:

"ہاں تو مسٹر راجر۔ اس شریف آدمی کو تم نے قتل کیا ہے؟"

"ن۔ نہیں۔"

"دیکھو بھئی۔ اب جھوٹ نہیں چلے گا۔ اگر تم نے قتل نہیں کیا تو پھر یہ بتانا ہوگا۔ تم یہاں کیوں موجود ہو؟"

"م۔ میں۔ میں۔"

"ہاں ہاں۔ گھڑ لو کوئی بات۔ ہمیں کون سا پتا چل جائے گا۔"

"کیا تم یہ اوزار اٹھانے آئے تھے؟"

"ہاں! میرے ساتھی یہ اوزار یہاں بھول گئے تھے۔ مجھے بھیجا گیا کہ اوزار اٹھا لاؤں۔ یہاں آیا۔ تو اس وقت یہ صاحب آگئے۔ انھوں نے مجھے دیکھ لیا۔ میں نے سوچا مارے گئے بس میں نے عقل سے کام نہیں لیا اور اسے ہلاک کر دیا۔"

"آخر تم نے مان ہی لیا۔ اب ذرا یہ بھی بتا دو کہ ٹرین

کہاں ہے؟"

"میں نہیں جانتا۔ ٹرین کہاں ہے۔ یہ ٹرین اغوا کرنے والے جانیں۔"

"تو تم ٹرین اغوا کرنے والوں میں شامل نہیں تھے؟"

"بالکل نہیں۔ میری ڈیوٹی تو مون پور سٹیشن پر تھی۔ میں وہیں پر تھا کہ ہدایت ملی کہ بند کارخانے میں میرے ساتھی کچھ اوزار بھول آئے ہیں۔ وہ اٹھا کر یہاں سے کھسک جاؤں۔ لیکن افسوس۔۔ میں کھسک نہیں سکا۔"

"تمھاری کہانی نے کچھ زیادہ متاثر نہیں کیا۔ خیر کوئی بات نہیں۔ ہم اس سے ہی گزارا کر لیتے ہیں۔ اب چلو۔" انسپکٹر جمشید نے منہ بنا کر کہا۔

انھوں نے اوزار قبضے میں کیے، لاش کو اسی حالت میں چھوڑا۔ اور سٹیشن کا رخ کیا۔ وہاں سے ماہرین کو فون کیا، انھیں ہدایات دے کر وہ ایک بار پھر اسی سمت میں نکل کھڑے ہوئے، اب ان کا رخ لوہے کے چالو کارخانے کی طرف تھا۔

"میں صرف یہ بات سوچ رہا ہوں۔ کہ اگر گاڑی کو اس بند کارخانے تک ہی لے جایا گیا تھا تو گاڑی کہاں گئی۔" محمود نے بڑبڑانے کے انداز میں کہا۔

"بھئی چل گئی ہو گی کہیں گھومنے پھرنے۔" فاروق بولا۔

"میرے ذہن میں ایک بات آ رہی ہے۔ راجر کو بند کارخانے کی طرف صرف اس لیے بھیجا گیا تھا کہ تفتیش کرنے والی پارٹیاں دھوکا کھا جائیں۔ اور صرف بند کارخانے تک ہی سوچنے پر مجبور ہو جائیں۔ اسے باقاعدہ یہ ہدایات بھی دی گئی تھیں کہ ریلوے کا کوئی ملازم۔ جو وہاں تک پہنچ جائے۔ اس کو بھی ٹھکانے لگا دیا جائے۔ اور وہ خود وہیں دبکا رہے۔ اور تفتیش کے لیے آنے والی پارٹی کو اپنی موجودگی کا احساس بھی دلاتا رہے۔ پھر آخر کار ان کے ہاتھوں پکڑا جائے۔" انسپکٹر جمشید کہتے چلے گئے۔

"ج۔ جی۔ کیا مطلب؟" وہ چونک اُٹھے۔

"ہاں! یہ سب کچھ ڈراما کیا گیا ہے۔ تاکہ ہم صرف اور صرف بند کارخانے کی طرف دھیان دیتے رہیں اور تفتیش میں بُری طرح ناکام ہو جائیں۔"

"اُف۔ اب تو ہمیں بھی بالکل یہی نظر آ رہا ہے۔"

"اور مُجرم چاہتے ہیں کہ ہم جلد ٹرین کا سُراغ نہ لگا سکیں، سراغ لگانے میں کامیاب اس وقت ہوں جب وہ کیپٹن ارشد اور ان کے ماتحت راشد سے کاغذات حاصل کر لیں۔"

"ہُوں۔ ایک حد تک تو وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہے

ہیں۔ انھوں نے ہمارا کافی وقت ضائع کر دیا ہے۔"

"میں سوچ رہا ہُوں۔ اس کہانی کے اصل ہیرو کیپٹن ارشد اور ان کے ماتحت ہیں۔ وہ کب تک ان لوگوں کا ظلم برداشت کرتے ہیں۔ اسی بنیاد پر سارے کیس کا دارو مدار ہے۔"

جیپ میں خاموشی چھا گئی۔ وہ سوچ میں ڈوب گئے۔ آخر لوہے کے کارخانے کے سامنے جیپ رک گئی۔ وہ نیچے اُترے۔ اب ان کے کانوں میں لوہے کا شور گونجنے لگا۔ معلوم ہوا۔ یہاں عمارتی سریا بنتا تھا۔ کارخانے کے دروازے پر مسلح نگران موجود تھے۔ وہ برابر ان کی طرف دیکھ رہے تھے:

"ہمیں اس کارخانے کو اندر سے دیکھنا ہے۔ ہمیں اس گاڑی کی تلاش ہے۔ جو غائب ہو گئی ہے۔"

"وہ۔ وہ بھلا یہاں کہاں؟" ایک نگران نے حیران ہو کر کہا۔

"یہی تو دیکھنا ہے۔ کہ وہ یہاں کیسے پہنچ گئی۔"

"آپ کا خیال غلط ہے جناب۔ ٹرین یہاں نہیں ہے۔"

"بھئی تم اپنے مینجر کو اطلاع دو۔ یہ میرا کارڈ ہے۔" انھوں نے منہ بنا کر کہا۔

"جی بہتر!"

ان میں سے ایک اندر چلا گیا۔ انھیں باہر ہی کھڑے رہنا پڑا۔ پانچ منٹ بعد اس نے واپس آ کر کہا:

"چلیے جناب۔ مینیجر صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔"

"انھیں خود دروازے پر آ جانا چاہیے تھا۔ ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔" انسپکٹر جمشید نے جل کر کہا۔

"یہ تو آپ نے نہیں کہا تھا جناب۔"

"تم جا کر انھیں لے آؤ۔ ہم اتنی دیر میں اندر کا جائزہ لے لیتے ہیں۔" وہ بولے۔

"جی بہتر!" اس نے کہا اور پھر اندر چلا گیا۔

اب وہ اندر داخل ہوئے۔ دوسرے نگران نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ انھوں نے جلدی جلدی کارخانے کو دیکھنا شروع کیا۔ دو منٹ بعد نگران مینیجر کو لیے ان کے پاس پہنچ گیا:

"یہی لوگ ہیں جناب۔"

وہ اس کی طرف مڑے:

"ہاں جناب۔ ہم لوگ ہی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں۔"

"مجھے شہباز خان کہتے ہیں۔ اس کارخانے کا مینیجر ہوں۔ کیا معاملہ ہے؟"

"آپ کو نہیں معلوم۔ کیا معاملہ ہے۔" انسپکٹر جمشید نے منہ بنایا۔

"ٹرین کا چکر ہے۔" وہ مسکرایا۔

"ہاں بالکل۔"

"تو پھر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں۔ ٹرین کو اس طرف

نہیں لایا گیا۔" اس نے کہا۔

"ایک بات تو آپ بھی تسلیم کریں گے۔" فاروق نے خشک لہجے میں کہا۔

"اور وہ کیا؟" اس نے فوراً کہا۔

"یہ کہ۔ آپ کے کارخانے میں ٹرین لانا بہت آسان کام تھا۔"

"ہاں! یہ تو ٹھیک ہے، لیکن ہمیں ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔" اس نے منہ بنایا۔

"یہ بعد کی بات ہے۔ پہلے ہمیں صرف یہ معلوم کرنا ہے کہ ٹرین کو اغوا کس نے کیا ہے۔ آپ کے علاوہ ایک مل ہے۔ کپڑے کی مل۔ اس تک بھی ٹرین لے جانا بہت آسان تھا۔ اور تیسرے وہ بند کارخانہ ہے۔"

"اوہ ہاں۔ واقعی۔ آپ کو تو چاہیے۔ فوراً اس طرف جائیں۔ ریل کی پٹڑی وہاں تک بھی گئی ہے۔ اور وہ کارخانہ چونکہ بند پڑا ہے۔ اس لیے وہاں ٹرین کو لے جانا باقی دونوں جگہوں کی نسبت زیادہ آسان اور بے خطر کام تھا، کیونکہ۔۔ ان دونوں جگہوں پر تو سیکڑوں آدمی دن رات کام کرتے ہیں، اتنے بہت سے آدمی تو ٹرین کا راز ہضم نہیں کر سکتے۔ پولیس ان لوگوں کو بڑا سا لالچ دے کر معلوم کر ہی سکتی ہے۔" اس نے جلدی جلدی کہا۔

"ہوں! آپ کی باتوں میں وزن ہے۔ لیکن ہمارا ایک اصول ہے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"اور وہ کیا؟"

"یہ کہ۔ ہم کسی کو بھی شک سے بری خیال نہیں کرتے جب تک کہ معاملہ حل نہ ہو جائے۔"

"گویا آپ کو شک ہے کہ ٹرین کو یہاں لایا گیا ہے۔"

"ہاں! یہی بات ہے۔"

"آپ شوق سے سارا کارخانہ گھوم پھر کر دیکھ لیں اور اگر کوئی شک کی بات نظر آ جائے تو مجھے گرفتار کر لیں۔" اس نے کہا۔

"بہت بہت شکریہ۔ آؤ بھئی۔"

وہ باریک بین نظروں سے جائزہ لیتے آگے بڑھنے لگے، خاص طور پر وہ ریل کی پٹڑی کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے، ریل کی پٹڑی۔ کارخانے کے اندر سے ہوتی اس کے آخر تک چلی گئی تھی۔ آخری حصے سے بھی وہ آگے نکل گئی تھی۔ اور اس سے آگے گھنا جنگل تھا۔ ساتھ ہی پہاڑیاں تھیں۔

"یہ پٹڑی باہر تک کیوں نکالی گئی ہے؟" انسپکٹر جمشید بولے۔

"یہ آج سے نہیں۔ شروع سے ہی نکلی ہوئی ہے۔" مینجر نے کہا۔

"لیکن کیوں؟ سوال تو یہ ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ضرورت سے زائد سامان اس جگہ اتروا لیا جاتا ہے۔ بعض اوقات اندر جگہ بھی نہیں ہوتی۔ اس صورت میں بھی سامان یہاں اتار لیا جاتا ہے۔ وہ سامان لوہے کا ہوتا ہے۔ بہت وزنی۔ اس کے چوری ہونے کا تو ڈر ہوتا نہیں۔" شہباز خان نے جلدی جلدی کہا۔

"ہوں۔" انسپکٹر جمشید بڑبڑائے اور پھر جنگل کی طرف قدم اٹھانے لگے۔ وہ بہت دور تک نکل گئے، پھر پلٹے:

"اچھا جناب۔ اب ہم چلیں گے۔"

"تو آپ کا شک دور ہو گیا نا؟"

"ابھی نہیں۔ جب تک مجرم نہیں پکڑے جاتے۔ اس وقت تک آپ اور آپ کا کارخانہ شک کی زد میں رہیں گے۔"

"مجھے کوئی پروا نہیں۔" اس نے جھنجھلا کر کہا۔

"جس نے کوئی جرم نہ کیا ہو۔ اسے پروا کی ضرورت بھی نہیں۔" محمود نے مسکرا کر کہا۔

کارخانے سے باہر نکل کر وہ ہل کی طرف روانہ ہوئے:

"شاید آج کے دن ہماری قسمت میں ناکامیاں ہی ناکامیاں لکھی ہیں۔" فاروق نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا۔

"بھئی کچھ تم لوگ بھی اپنی عقلوں کو استعمال کرو نا۔"

"میری عقل کام کر رہی ہے ابّا جان۔" فرزانہ بول اُٹھی۔

"تو کہو۔ وہ کیا کر رہی ہے؟"

"آپ کیپٹن سرگم۔ اور راجر سے پُوچھ گچھ کر لیں۔ اور انھیں کمرۂ امتحان میں لے جائیں۔ بہت جلد بہترین نتائج برآمد ہوں گے۔"

"ہو سکتا ہے۔ ایسا ہو جائے۔ ہم یہ بھی کریں گے۔ لیکن پہلے مِل کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ میں یہ بھی تو دیکھنا چاہتا ہوں کہ آخر ٹرین کو کس طرح غائب کیا گیا ہے۔ اور میں یہ بات اپنی عقل سے معلوم کرنے کی خواہش محسوس کر رہا ہوں۔ یہ کیا ہوا کہ ہم ان پر سختی کریں اور وہ سب کچھ اُگل دیں۔ کیوں نہ ہم ان کی بجائے اپنی عقل کے ذریعے یہ معلوم کریں۔"

"بات آپ کی بالکل بجا ہے، لیکن ہمارے پاس وقت کم ہے۔"

"خیر۔ اب اتنا بھی کم نہیں۔"

مِل کے مالک کو شاید پہلے ہی کسی نے بتا دیا تھا کہ یہ لوگ آ رہے ہیں۔ لہٰذا وہ باہر کھڑا ملا اور ان کا پُرجوش استقبال کیا:

"آپ کو کیسے معلوم ہو گیا۔ کہ ہم مِل دیکھنے آ رہے ہیں۔"

"شہباز خان نے فون کیا تھا۔ وہ میرے دوست ہیں۔"

"اوہ اچھا۔" انسپکٹر جمشید نے چونک کر کہا۔

"آپ کا نام کیا ہے جناب؟"

"میں اقبال قاسم ہوں۔ اور یقین دلاتا ہوں کہ ٹرین کو مِل میں نہیں لایا گیا۔ ویسے بھی جناب۔ ٹرین کوئی چھوٹی سی چیز تو ہوتی نہیں کہ۔ اسے چھپایا جا سکتا ہے۔"

"یہی تو سب سے عجیب بات ہے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"جی۔ کیا مطلب؟"

"یہ کہ۔ ٹرین چھوٹی سی چیز نہیں ہوتی، لیکن اس کے باوجود وہ غائب ہے۔ اور اس طرح غائب ہے۔ جیسے کبھی تھی ہی نہیں۔"

"ہوں واقعی۔ آپ بھی ٹھیک کہتے ہیں۔ خیر جناب۔ میری مِل حاضر ہے۔ آپ اس کی اچھی طرح تلاشی لیں۔"

انھوں نے مِل کا معائنہ شروع کیا۔ ریل کی پٹڑی کے ساتھ ساتھ چلتے وہ اس کے آخری سرے تک پہنچ گئے۔ آخری سرا کارخانے کے اندر ہی ختم ہو جاتا تھا۔ اس کے آگے سیمنٹ کا چبوترہ بنا تھا۔ مِل کے پچھلے حصّے کی طرف نکل کر بھی انھوں نے جائزہ لیا۔ اس طرف بھی درخت ہی درخت تھے۔ اور دُور چند پہاڑیاں تھیں۔

"سون پور اور راول گنج کے درمیان شاید تمام راستے میں پہاڑیاں موجود ہیں؟" انسپکٹر جمشید نے سوالیہ انداز میں

اقبال قاسم کی طرف دیکھا۔

"جی ہاں۔ یہ ٹھیک ہے۔"

"ان پہاڑیوں میں کوئی غار وار تو نہیں ہیں؟"

"جی۔ غار۔ کیا مطلب؟" اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

"غار کا مطلب تو جناب غار ہی ہوتا ہے۔ اور ہرگز نہیں ہوتا۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"میں نہیں جانتا۔ ان پہاڑیوں میں غار ہیں یا نہیں۔ یہ معلوم کرنے کی میں نے کبھی ضرورت بھی تو محسوس نہیں کی، آپ کو ضرورت ہے تو ان پہاڑیوں میں گھوم پھر کر کیوں نہیں دیکھ لیتے۔"

"کاش۔ میرے پاس اتنا وقت ہوتا۔" انھوں نے سرد آہ بھری۔

"جب بھی وقت ملے۔ یہ کام کر لیجیے گا۔" اقبال قاسم نے کہا۔

"مسٹر قاسم۔ آپ طنز کر رہے ہیں شاید۔ لیکن آپ نہیں جانتے، ہم کس مشکل میں گرفتار ہیں۔ خیر آپ سے پھر کبھی بات کرنے کے لیے آؤں گا۔ ویسے آپ کے خیال میں ٹرین کس طرح غائب ہو سکتی ہے؟"

"بند کارخانے کے ذریعے۔" اس نے فوراً کہا۔

"کیا مطلب۔ کیا آپ نے بند کارخانے کو اندر سے دیکھا ہے،

اور اس کو دیکھنے کی آپ کو کیا ضرورت پڑ گئی تھی۔"

"کسی زمانے میں میں اسی کارخانے کا مینجر تھا۔"

"کیا!!!" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔ چہروں پر حیرت دوڑ گئی۔

"جی ہاں! اس کارخانے کا مینجر تھا، لیکن اس مل کا مالک ہوں۔ یہ وقت وقت کی بات ہے۔ آپ حیران کس بات پر ہو رہے ہیں۔"

"ہاں! واقعی۔ ہمیں حیران نہیں ہونا چاہیے، لیکن آپ اتنا تو بتا دیں کہ بند کارخانے میں ٹرین غائب کیسے ہو سکتی ہے۔ لے جائی تو خیر جا سکتی ہے۔"

"آپ جڑ کے آدمی کو کیوں نہیں پکڑتے۔" اس نے منہ بنا کر کہا۔

"جڑ کا آدمی۔ کیا مطلب؟" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

سوال یہ ہے

"ہاں! جڑ کا آدمی۔ دیکھیں نا۔ گاڑی کو مون پور سے راول گنج جانا تھا۔ ریل کی پٹڑی بالکل سیدھی ہے۔ اس میں کوئی اُلجھن نہیں ہے۔ تو پھر ٹرین سیدھی کیوں نہیں گئی، کسی طرف مُڑ کیوں گئی۔ صاف ظاہر ہے۔ کانٹے والے نے کانٹا بدل دیا تھا۔ اور وہ کیوں نہ بدلتا، اسے یہی ہدایات تھیں، کانٹا بدلنے کی دیر تھی۔ گاڑی سیدھی جانے کی بجائے اس طرف مُڑ گئی۔" اقبال قاسم پُرسکون انداز میں کہتا چلا گیا۔

"لیکن کانٹا تو کوئی بھی بدل سکتا ہے۔ یہ کیا مشکل کام ہے۔ لہٰذا ہم جڑ کا آدمی کس کو سمجھیں۔" انسپکٹر جمشید نے منہ بنا کر کہا۔

"کانٹے والے کی یہ ذمّے داری بھی ہوتی ہے کہ وہ اس وقت تک کانٹے والی جگہ موجود رہے۔ جب تک کہ گاڑی گزر نہ جائے۔ تاکہ کوئی غلط آدمی غلط حرکت نہ کر دے۔ پھر۔ کیا

وجہ ہے کہ کانٹا بدلنے والے سے اس سلسلے میں پوچھ گچھ نہیں کی گئی۔"

"جہاں تک میرا خیال ہے۔ ریلوے آفیسرز نے اس سے ضرور پوچھ گچھ کی ہو گی۔ قصور اگر اس کا نکلا ہوتا تو ضرور یہ بات اب تک ہمیں بتا دی گئی ہوتی۔"

"آپ کی مرضی۔ میں اسی کو جڑ کا آدمی خیال کرتا ہوں۔"

"خیر۔ ہم جڑ کے آدمی سے بھی بات کر لیتے ہیں۔ آپ فکر نہ کریں۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"بھلا میں کیوں فکر کروں گا۔ یہ مسئلہ آپ کا ہے۔" اس نے منہ بنایا۔

"شکریہ جناب۔ آپ سے بہت کام کی باتیں معلوم ہوئیں۔ آؤ بھئی چلیں۔"

وہ وہاں سے روانہ ہوئے۔ اور مون پور سٹیشن پہنچے۔ انھوں نے پہلے راول گنج ملٹری آفس کو فون کیا:

"ہیلو۔ انسپکٹر جمشید بول رہا ہوں۔ کوئی نئی خبر تو نہیں؟"

"بلیک میلر کا فون ایک بار پھر ملا تھا۔ اس نے دھمکی دی ہے کہ پورے چار گھنٹے گزرتے ہی وہ راز شارجستان کے حوالے کر دے گا۔ لہٰذا پانچ کروڑ ادا کر کے ٹرین کے مسافر اور کاغذات حاصل کر لو۔" اس طرف سے بتایا گیا۔

"اس کا مطلب ہے ۔ وہ ابھی تک کاغذات حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔"

"خیال تو یہی ہے۔ اگر ہو گیا ہوتا تو ہمیں فون کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی اسے۔"

"ہوں! اللہ مالک ہے۔"

"آپ کو اب تک کوئی کامیابی ہوئی یا نہیں؟"

"امید تو یہی ہے کہ بہت جلد کامیاب ہو جائیں گے ۔ آگے اللہ کو جو منظور۔" انھوں نے یہ کہا اور ریسیور رکھ دیا ۔

اس کے بعد وہ سب سٹیشن ماسٹر کی طرف مُڑے :

"اس لائن پر کتنے کانٹا بدلنے والے ہیں؟"

"صرف چار ۔ تین مون پور کی حدود کے ۔ ایک راول گنج کا۔"

"گویا یہ تینوں مقامات مون پور کو لگتے ہیں۔" انھوں نے کہا ۔

"جی ہاں!"

"کیا ان تینوں سے پوچھ گچھ کی جا چکی ہے؟"

"جی ہاں! ان میں سے ایک کا کہنا یہ ہے کہ وہ چند منٹ کے لیے کانٹے کے پاس سے ہٹا تھا ۔ اس کے پیٹ میں شدید قسم کا مروڑ اچانک اُٹھا تھا۔"

"اور پھر ۔ اس نے کیا کیا؟"

"وہ لیٹرین میں چلا گیا تھا ۔ فارغ ہو کر آیا تو ٹرین گزر چکی تھی۔"

"اور باقی دو کا بیان کیا ہے؟"

"وہ اپنے کانٹوں پر بدستور موجود رہے ہیں۔"

"یہ صاحب جن کے پیٹ میں مروڑ اٹھا تھا ۔ کون سے کانٹے پر تھے؟"

"لوہے کے کارخانے والے پر۔"

"شکریہ ۔ اس کو ہمارے سامنے پیش کیا جائے۔"

جلد ہی ایک پتلا دبلا زرد چہرے والا آدمی ان کے سامنے لایا گیا ۔

"آپ کا نام؟"

"فیروز دین۔"

"ہم نے سنا ہے ۔ آپ کے پیٹ میں مروڑ اٹھا تھا۔"

"جی ہاں! یہی بات ہے۔"

"آپ ہمارے ساتھ چلیے ۔ ہم آپ کی ڈیوٹی کی جگہ دیکھنا چاہتے ہیں اور آپ کی رہائش بھی۔"

"چلیے۔" اس نے کہا ۔

وہ ان کے ساتھ جیپ میں بیٹھ گیا ۔ جیپ آگے بڑھ گئی:

"اس قسم کا مروڑ آپ کے پیٹ میں پہلے بھی اٹھا ہے

کبھی؟"

"جی نہیں۔ زندگی میں پہلی بار۔ بہت عجیب سا درد تھا۔ میں تو بے دم ہی ہو گیا تھا۔"

"کیا آپ کو لیٹرین میں اتنی دیر لگ گئی تھی کہ کوئی کانٹا بدل دے اور ٹرین اس طرف چلی جائے۔ اس قدر فاصلے پر کہ آپ کے آنے پر آپ کو اس طرف جاتی نظر بھی نہ آئے؟"

"ہاں جناب۔ مجھے کافی دیر لگ گئی تھی۔"

"آپ شہباز خان کو جانتے ہیں؟"

"جی ہاں جناب۔ کارخانے کے مینجر ہیں وہ۔ اکثر ان کا مال آتا رہتا ہے اور مجھے ان کی طرف کا کانٹا بدلنا پڑتا ہے۔"

"شکریہ! وہ کیسے آدمی ہیں؟"

"بہت اچھے۔ بہت معقول۔"

"آپ کو ہر ماہ کتنے پیسے دیتے ہیں؟" فاروق نے اچانک سوال پوچھا، انسپکٹر جمشید نے اسے گھور کر دیکھا، پھر مسکرا دیے۔

"جی۔ کیا مطلب؟" وہ بُری طرح چونکے۔

"میں نے صرف یہ پوچھا ہے کہ آپ کو ہر ماہ شہباز خان کتنے پیسے دیتا ہے؟"

"وہ کیوں دینے لگے مجھے پیسے۔"

"پھر یہ سوال سُن کر آپ چونکے کیوں تھے؟"

"سوال ہی ایسا تھا۔" اس نے منہ بنا کر کہا۔

"خیر۔ آئیے چلیں۔"

وہ اسے ساتھ لیے اس کے کوارٹر میں داخل ہوئے۔ معلوم ہوا کوارٹر میں وہ بالکل تنہا رہتا تھا۔ اس کی بیوی فوت ہو چکی تھی اور کوئی بچہ بھی نہیں چھوڑ گئی تھی۔ انھوں نے کوارٹر کا جائزہ لیا۔ ہر چیز بے ترتیب تھی۔ شاید وہ باقاعدہ آدمی نہیں تھا۔ ایک طرف ایک گلاس پڑا تھا جس کے پیندے میں کچھ دودھ باقی پڑا تھا۔ کچھ دودھ فرش پر گر کر جم گیا تھا۔

"آج آپ نے کیا کھایا پیا تھا؟"

"آپ کا مطلب ہے۔ درد ہونے سے پہلے؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں! درد سے پہلے۔"

"صبح ناشتے میں دودھ کا ایک گلاس پیا تھا اور بس۔ یہ میرا روز کا معمول ہے۔ میں چائے کا عادی نہیں۔ نہ صبح کچھ کھاتا ہوں۔"

"تب پھر اس دودھ کو چیک کرنا پڑے گا۔ محمود اسے محفوظ کر لو۔"

"جی بہتر۔" اس نے کہا۔ جیب سے ایک ننھی سی شیشی نکالی

اور بچا ہوا دُودھ اس میں انڈیل لیا :

" یہ — آپ کیا کر رہے ہیں؟"

" ہمارا خیال ہے — اگر آپ کے پیٹ میں واقعی دَرد ہوا تھا تو اس دُودھ میں آپ کو کوئی چیز دی گئی تھی"

" اوہ!" اس کے منہ سے نِکلا —

" اور اگر اس دُودھ میں کچھ نہیں ہے تو پھر آپ کا دَرد فرضی تھا — اور کانٹا خود آپ نے بدلا تھا — آپ اس سازش میں برابر کے شریک ہوں گے"

" ن — نہیں — ایسی کوئی بات نہیں" اس نے خوف زدہ ہو کر کہا ، پھر سنبھل کر بولا :

" اور پھر — اگر ایسی بات ہے تو گاڑی تو لوہے کے کارخانے میں موجود ہونی چاہیے — جب کہ آپ لوگ وہاں ہو آئے ہیں"

" تمھیں کس طرح پتا چلا کہ ہم وہاں ہو آئے ہیں"

" کارخانے کا ایک مُلازم بتا رہا تھا — ہر طرف اس واقعے کے بارے میں باتیں ہو رہی ہیں جناب — یہ کوئی معمولی یا عام سا واقعہ تو ہے نہیں — پوری ایک ٹرین غائب ہے — جب کہ اس میں مُسافر بھی تھے"

" ہوں — واقعی"

وُہ ناکام واپس پلٹے — اس وقت تک کی بھرپُور کوشش کے باوجود ٹرین کا کوئی سُراغ نہیں لگ سکا تھا — اب وُہ راول گنج جانے کے سوا کیا کر سکتے تھے — وہاں ملٹری آفیسرز کا اجلاس جاری تھا — ان کے اندر داخل ہوتے ہی سب کی نظریں ان پر جم گئیں —

" میں نہایت افسوس سے یہ کہوں گا کہ ابھی تک کوئی کامیابی نہیں ہو سکی — ٹرین اس طرح غائب ہے — جس طرح گدھے کے سر سے سینگ غائب ہیں — وُہ کوئی چھوٹی سی چیز نہیں ہے — کہ کسی نے اپنے گھر میں کسی خفیہ جگہ چھپا لیا ہو گا — تمام امکانی جگہوں کو ہم دیکھ چکے ہیں — لے دے کے ہمارے پاس کیپٹن سرگم اور راجر موجود ہیں — یہ دونوں ضرور اس سازش میں شریک ہیں — اگر ہم کچھ معلوم کر سکتے ہیں تو ان سے — اسی لیے ہم یہاں آگئے ہیں — تاکہ انھیں کرید سکیں — دُوسرے یہ کہ ہمارے پاس تھوڑا سا دُودھ ہے — اس کا تجزیہ کرایا جائے گا"

" ہُوں! یہ تو کافی تشویش والی بات ہو گی — اگر ادھر کیپٹن ارشد اور سارجنٹ راشد نے ہتھیار ڈال دیے اور کاغذات کے بارے میں بتا دیا تو کیا ہو گا — پھر تو وُہ بلیک میلر ہمیں فون نہیں کرے گا ، کیونکہ اس صُورت میں شارجستان

ہم سے زیادہ اسے پیسے دے سکتا ہے۔" کمانڈر انچیف نے فکرمندانہ انداز میں کہا۔

"تب پھر میری ایک تجویز ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"کہیے!"

"پانچ کروڑ والی شرط مان لی جائے۔ اس وقت معاملہ پانچ کروڑ میں طے ہو رہا ہے۔ ہمارے مسافر اور کاغذات ہمیں واپس مل جائیں گے۔ اور اس کا بھی امکان ہے کہ ہم مجرموں کو فرار نہ ہونے دیں اور ہمارے پانچ کروڑ بھی ضائع نہ ہوں۔ اگرچہ انھوں نے اس کا بھی کوئی نہ کوئی انتظام کر رکھا ہوگا۔ اس وقت اس کے سوا کچھ نہیں کیا جا سکتا۔"

"تب پھر ہمیں صدر صاحب سے مشورہ کرنا ہوگا۔" کمانڈر انچیف نے کہا۔

"ضرور کریں۔ وقت کم ہے۔ جلدی کر لیں۔"

صدر صاحب سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش شروع کر دی گئی۔ ادھر انسپکٹر جمشید نے ایک ملٹری مین کے ذریعے وہ دودھ لیبارٹری بھیج دیا۔ آخر صدر صاحب سے رابطہ قائم ہو گیا۔ کمانڈر انچیف نے انھیں ساری صورتِ حال سنائی اور آخر میں انسپکٹر جمشید کی رائے پیش کی۔ پھر ریسیور ان کی طرف

بڑھاتے ہوئے وہ بولے:

"صدر صاحب آپ سے خود بات کریں گے۔"

"جی بہتر!" انھوں نے کہا اور ریسیور میں بولے:

"ہیلو سر۔ خادم عرض کر رہا ہوں۔"

"جمشید۔ یہ میں نے کیا سنا ہے۔ تم ٹرین کو تلاش کرنے میں ناکام ہو گئے ہو۔"

"ہاں جنابِ عالی۔ یہ ٹھیک ہے۔ لیکن اس میں ہماری کسی کوتاہی کو دخل نہیں۔ مجرموں نے پہلے سے منصوبہ بندی کر رکھی ہے۔ جب کہ ہمیں کچھ بھی معلوم نہیں۔ انھیں معلوم ہے۔ کس مقام پر کھڑے ہیں جب کہ ہمیں کچھ اندازہ نہیں۔"

"ہوں! تو پھر۔ کیا ہمیں پانچ کروڑ دینا پڑیں گے؟"

"فی الحال ہم یہی ظاہر کریں گے سر۔ اس کی تجویز تو مان لیں۔ شاید اس تجویز میں کوئی ایسا رخنہ نکل آئے جس سے ہم فائدہ اٹھا سکیں۔"

"ہوں! اچھی بات ہے۔ جیسے تم مناسب سمجھو۔ میری طرف سے اجازت ہے۔" انھوں نے کہا۔

اب انھیں بلیک میلر کے فون کا انتظار کرنے کے سوا کوئی کام نہیں تھا۔ ابھی وہ انتظار کر رہے تھے کہ دودھ کی رپورٹ آ گئی۔

"دودھ میں ایک ایسی دوا ملائی گئی تھی۔ جو پیٹ میں گڑبڑ کر دے۔"

رپورٹ کے الفاظ یہ تھے۔ ان سب نے پڑھے۔

"اس کا تو صاف مطلب یہ ہے کہ ٹرین لوہے کے کارخانے میں لے جائی گئی ہے۔" محمود بڑبڑایا۔

"لیکن اس بات کو ثابت کرنا آسان نہیں، کیونکہ وہاں کوئی ٹرین نہیں ہے۔"

"میرا خیال ہے۔ ہم یہاں بیٹھ کر کیا کریں گے۔ یہاں تو ابا جان ہی کافی رہیں گے۔ کیوں نہ ہم ٹرین کا سراغ لگانے کی کوشش کریں۔" فاروق نے تجویز پیش کی۔

"شکر ہے اللہ کا۔ کوئی تو کام کی بات پیش کی تم نے۔" فرزانہ نے خوش ہو کر کہا۔

"تو تمہیں کسی نے روکا ہوا تھا۔ تم پیش کر سکتی تھیں یہ تجویز۔" فاروق نے جل کر کہا۔

"اور تم کیوں جل رہے ہو بلا وجہ؟"

"اگر جانا ہے تو جاؤ۔ اور کوئی کام کر کے دکھاؤ۔ باتیں نہیں چلیں گی۔"

"اگر ساتھ ساتھ باتیں بھی چلتی رہیں تو کیا حرج ہے ابا جان۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"یاد تم جاتے ہو یا۔" انھوں نے دھمکی دینے کے انداز میں کہا۔

وہ جانے کے لیے اُٹھے ہی تھے کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی، ان کے اُٹھتے قدم رُک گئے۔

"تم کیوں رُکے؟" انسپکٹر جمشید نے انھیں گھورا۔

"جی۔ وہ۔ ذرا۔ یہ تو دیکھ لیں کہ فون کس کا ہے۔ کہیں اسی کا نہ ہو۔"

"اُمید تو نہیں کہ بلیک میلر کا ہوگا۔ اور اگر ہو تو بھی تم سُن کر کیا کرو گے۔ تم اپنا کام کرو۔" انسپکٹر جمشید مُسکرائے۔

"اس طرح ہمیں اُلجھن رہے گی ابا جان۔"

"چلو خیر۔ سُن لو۔"

اُدھر کمانڈر انچیف نے ریسیور اُٹھا کر ہیلو کہا۔

"ہیلو۔ کیا سوچا ہے جناب۔ چار گھنٹے گزر چکے ہیں۔"

"ہمارے ایک ساتھی آپ سے بات کریں گے۔ لیجیے جناب۔" انھوں نے انسپکٹر جمشید کی طرف اشارہ کیا۔ ریسیور لے کر وہ بولے:

"ہمیں آپ کی تجویز منظور ہے۔ ہم پانچ کروڑ دینے کے لیے تیار ہیں۔ بشرطیکہ ٹرین، اس کے مسافر اور کاغذات ہمارے حوالے کر دیے جائیں۔"

"ٹھیک ہے — میں تیار ہوں۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔

"طریقہ کار بتائیں۔"

"بہت سیدھی اور بہت آسان تجویز ہے۔" دوسری طرف سے ہنس کر کہا گیا۔

"اور وہ کیا؟"

"پانچ کروڑ روپے میرے نام سے ایک غیر ملکی بنک کی بیرونِ ملک شاخ میں جمع کرانا ہوں گے — ابھی بذریعہ فون یہ کام کریں — جب میرا بنک مجھے اطمینان دلا دے گا کہ رقم جمع ہو چکی ہے — تو ٹرین، مسافر اور کاغذات آپ کو مل جائیں گے۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ نہ ملیں۔" انھوں نے منہ بنایا۔

"آپ لوگ مجھ پر اعتبار کرنے پر مجبور ہیں۔"

"ہوں! خیر — میں اپنے ساتھیوں سے مشورہ کر لوں۔"

"ضرور — میں ایک گھنٹے بعد پھر فون کروں گا۔"

دوسری طرف سے ریسیور رکھ دیا گیا:

"اس نے ایسی ترکیب بتائی ہے کہ — ہم کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے — سوائے اس کے کہ پانچ کروڑ ادا کر کے اپنے مسافر اور کاغذات حاصل کر لیں۔" انھوں نے کہا اور تجویز بتا دی۔

"پھر — آپ کا کیا خیال ہے؟"

"ہمیں اس طرح کچھ اور وقت مل گیا ہے — ایک گھنٹے بعد وہ پھر فون کرے گا — فون پر اس سے کہہ دیا جائے کہ ٹھیک ہے — ہم پانچ کروڑ جمع کرانے کے لیے تیار ہیں — اور ادھر ہم لوگ اپنی کوشش جاری رکھیں گے۔"

"گویا رقم جمع نہیں کرائی جائے گی۔" کمانڈر انچیف بولے۔

"جی — نہیں — اس لیے کہ میں اس کی ترکیب سمجھ گیا ہوں — وہ پانچ کروڑ لے کر بھی ٹرین ہمارے حوالے نہیں کرے گا — وہ جان چکا ہے کہ ہم اس کی تلاش میں بُری طرح ناکام ہو چکے ہیں۔"

"اوہ!" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

"تب پھر ہمیں اجازت دیں ابا جان — کیا ہم ایک عدد جیپ لے جا سکتے ہیں؟" یہ بات انھوں نے کمانڈر انچیف کی طرف منہ کر کے کہی۔

"ایک کیا — دس لے جائیں۔"

"جی نہیں — ابھی ہمارا جیپیں چھپانے کا کوئی پروگرام نہیں، جب بھی پروگرام بنا — آپ سے لے لیں گے۔" فاروق نے کہا اور ایسے حالات میں بھی ان کے چہروں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

تینوں کو جیپ دروازے پر تیار مل گئی۔

"ہاں بھئی — کیا خیال ہے؟" محمود بولا۔

"کس بارے میں؟" فاروق نے پوچھا۔

"پہلے کہاں چلا جائے؟"

"وہاں۔ جہاں ٹرین موجود ہے۔"

"کاش ہمیں اس جگہ کے بارے میں علم ہوتا۔"

"مجھے رہ رہ کر اس بند کارخانے کا خیال آ رہا ہے۔" فرزانہ بڑبڑائی۔

"لیکن۔ اگر ٹرین کو وہاں لے جایا گیا ہوتا تو ٹرین وہیں ہوتی۔" محمود نے منہ بنایا۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے ٹرین کو کہیں چھپایا گیا ہے۔"

"کیا کر رہی ہو۔ ٹرین کوئی ننھا سا کھلونا تو نہیں ہے۔" فاروق نے جھنا کر کہا۔

"تب پھر۔ تم ہی بتاؤ۔ ٹرین کہاں چلی گئی۔ ان تین جگہوں کے علاوہ تو کہیں جا ہی نہیں سکتی تھی۔"

"سچ تو یہ ہے کہ اس کیس نے ہمیں گھن چکر بنا دیا ہے۔" محمود بولا۔

"کاغذات ٹرین کے ذریعے لائے جانے کا پروگرام پہلے ہی بن چکا تھا۔ اور بلیک میلر کو۔ بلیک میلر کو۔ بلیک میلر کو۔" فرزانہ کہتے کہتے رک گئی۔

"بس۔ اٹک گئی سوئی۔ اب ان الفاظ سے آگے تو بڑھ

ہی نہیں سکو گی۔" فاروق جل گیا۔

"شاندار خیال۔ ہم بے وقوف ہیں۔" فرزانہ چلائی۔

"ہاں واقعی۔ یہ بہت شاندار خیال ہے کہ ہم بے وقوف ہیں، افسوس پہلے کیوں نہ آیا۔" فاروق نے سر ہلایا۔

"یہ بات نہیں۔ خیال یہ آیا ہے کہ بلیک میلر کو آخر کس طرح پتا چل گیا کہ کاغذات کو ٹرین کے ذریعے لایا جا رہا ہے۔"

"اوہ۔ اوہ۔" ان کے منہ سے نکلا۔

دوسرے ہی لمحے محمود نے جیپ کا رخ موڑ دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ پھر ملٹری آفس کے سامنے جیپ سے اتر رہے تھے۔ آفس میں اب تک سب لوگ جوں کے توں بیٹھے تھے۔ انھیں اندر داخل ہوتے دیکھ کر وہ چونک اٹھے۔

"خیر تو ہے۔ تم لوگ واپس آ گئے۔" انسپکٹر جمشید نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔ خان رحمان اور پروفیسر داؤد بھی حیران تھے۔

"پپ۔ پروگرام بدل گیا ہے ابا جان۔"

"کک۔ کیا مطلب؟" وہ چونکے۔

"ایک اہم ترین سوال۔ ابھی ابھی ذہن میں آیا ہے۔ اور اس کی طرف پہلے کسی کا خیال نہیں گیا۔ ہم نے سوچا۔

پہلے وہ سوال پوچھ لیا جائے۔"

"سوال کیا ہے؟" انسپکٹر جمشید نے حیرت زدہ لہجے میں پوچھا۔

"آخر بلیک میلر کو کس طرح پتا چلا کہ فوجی نوعیت کے کاغذات اس ٹرین سے بھیجے جائیں گے۔ یہ بات کن کن حضرات کو معلوم تھی؟"

"اوہ!" وہ دھک سے رہ گئے۔ اس سوال کی طرف تو سب سے پہلے توجہ دی جانی چاہیے تھی:

"دراصل ہم ٹرین کے چکر میں پڑ گئے۔ ہم نے یہ خیال کر لیا تھا کہ ہم ٹرین کو تلاش کر لیں گے۔ اور مجرم تک پہنچ جائیں گے۔ جب ٹرین نہ ملی تو ذہنوں کو اِدھر اُدھر دوڑانے کی ضرورت پیش آئی۔" محمود جلدی جلدی کہہ گیا۔

"بہت خوب محمود۔ سر۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں۔ یہ بات کن کن صاحبان کو معلوم تھی؟" انسپکٹر جمشید کمانڈر انچیف کی طرف مڑے۔

"مجھے۔ کرنل خاور اور میجر ربانی کو۔" انھوں نے جلدی جلدی کہا۔

"شکریہ۔ کیا ہم ان تینوں سے پوچھ گچھ کر سکتے ہیں؟"

"کیا مطلب۔ کیا آپ مجھ سے بھی پوچھ گچھ کریں گے؟"

"ہاں جناب۔ یہ ہمارا اصول ہے۔ تین نام سامنے آئے ہیں۔ صرف ان تین کو یہ بات معلوم تھی کہ کاغذات اس گاڑی کے ذریعے آ رہے ہیں۔ لہٰذا آپ تینوں سے ہی سوالات کرنا ہوں گے۔ یا پھر آپ یہ بتائیں۔ کہ آپ کے علاوہ یہ بات کسی اور کو بھی معلوم تھی۔"

"اُف مالک۔" ایک آفیسر اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"خیر تو ہے میجر ربانی۔"

سب کے سب چونک کر ان کی طرف دیکھنے لگے۔

"آئیے۔ میرے ساتھ۔ میں آپ کا مجرم آپ کے حوالے کر دوں۔"

"کیا مطلب؟" ان سب کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

"جلدی کریں۔ کہیں وہ نکل نہ جائے۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی انھوں نے باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔

"کک۔ کہیں۔ یہ فرار تو نہیں ہو رہے۔" انسپکٹر جمشید گھبرا گئے اور ان کے پیچھے دوڑ پڑے۔

پھر تو سبھی دوڑ پڑے، لیکن یہ دیکھ کر انھوں نے اطمینان کا سانس لیا کہ میجر ربانی اپنی جیپ میں بیٹھے ان کا انتظار

کر رہے تھے۔

"میرا خیال ہے۔ سب کو جانے کی ضرورت نہیں۔ انسپکٹر جمشید کے ساتھ دو چار ساتھی چلے جائیں۔" میجر ربانی بولے۔

"ٹھیک ہے۔ میں اور کرنل خاور ساتھ چلتے ہیں۔" کمانڈر بولے۔

ایک منٹ بعد چند جیپیں آندھی اور طوفان کی طرح ایک سمت میں اُڑی جا رہی تھیں، لیکن انھیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ جانا کہاں ہے۔

جس کی تھی تلاش

میجر ربانی کی جیپ ایک کوٹھی کے سامنے رُک گئی۔ ساتھ ہی انھوں نے کمانڈر انچیف اور کرنل خاور کے چہرے پر شدید الجھن کے آثار دیکھے:

"یہ۔ یہ کیا۔ میجر ربانی؟"

"آئیے۔ یہ باتوں کا وقت نہیں ہے۔" انھوں نے کہا اور کوٹھی میں داخل ہو گئے۔ بیرونی دروازہ بند نہیں تھا۔ وہ ان کے پیچھے اندر داخل ہوئے۔

"ہیلو بیگم۔" انھوں نے میجر ربانی کی آواز سُنی۔

"ارے۔ آپ۔ آج اتنی جلدی آ گئے۔ ہائیں۔ آپ کے ساتھ مہمان بھی ہیں۔"

انھوں نے دیکھا۔ ایک جوان اور خوبصورت عورت جلدی سے ان کی طرف بڑھ رہی تھی:

"ہاں بیگم۔ بس اچانک پروگرام بن گیا۔ تمھیں حیرت تو

نہیں ہوئی۔"

"ہوئی تو ہے۔ لیکن حیرت کا اظہار بعد میں کر لوں گی۔ پہلے تو آپ لوگوں کے لیے کچھ تیار کر لوں۔"

"نہیں بیگم۔ پہلے میری ایک بات سُن لو۔" میجر ربّانی نے کہا۔ اور پھر ان کا ہاتھ جیب سے باہر نکل آیا۔

وہ سب چونک اُٹھے۔ ان کے ہاتھ میں پستول تھا۔

"یہ۔ یہ کیا۔ آپ نے تو پستول نکال لیا۔ خیر تو ہے۔ یہ آپ کے چہرے پر عجیب سے آثار کیوں ہیں؟"

"بیگم۔ ایک ہفتہ پہلے میرے منہ سے ایک بات نکل گئی تھی۔ تمہیں یاد ہے وہ بات؟"

"کک۔ کون سی بات؟"

"یہ کہ آج کے دن ٹورین ایکسپریس سے کچھ اہم ترین فوجی نوعیت کے کاغذات لائے جائیں گے۔"

"ہاں شاید۔ آپ نے ایسی کوئی بات کہی تو تھی۔ تو پھر کیا بات ہو گئی۔"

"تت۔ تم نے۔ تم نے یہ بات اپنے تک نہیں رکھی بیگم۔ غلطی بے شک مجھ سے ہو گئی تھی۔ لیکن اصل غلطی تم نے کی۔ بات کو آگے کر دیا۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا۔"

"مم۔ میں نے۔ میں نے کسی کو نہیں بتائی۔"

"اب جھوٹ بولنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا بیگم۔ مجھے یقین ہے۔ تم نے ایسا کیا ہے۔ تم نے اس بات کا ذکر ضرور اپنے بھائی سے کیا ہوگا۔"

"کیا!!!" بیگم ربّانی نے چلّا کر کہا۔ ساتھ ہی ان کی آنکھیں خوف کی زیادتی سے پھیل گئیں۔

"دیکھا۔ میرا اندازہ ٹھیک تھا نا۔" ربّانی زہریلے انداز میں مسکرائے۔

"ہاں! آپ ٹھیک کہتے ہیں، لیکن مجھ سے بھی ایسا بے خیالی میں ہوا۔ بس باتوں باتوں میں ذکر کر بیٹھی۔"

"لیکن بیگم ہم دونوں کی اس سنگین غلطی نے ہمیں کس خوفناک موڑ پر لا کھڑا کیا ہے۔ ہمارے ساتھ تو اب جو بیتے گی، بیتے گی۔ مشکل یہ ہے کہ پورا ملک اس وقت خطرے کی زد میں آ چکا ہے۔"

"جی۔ کیا کہا۔ پورا ملک۔" بیگم ربّانی نے کانپ کر کہا۔

"ہاں! پورا ملک۔ وہ کاغذات بہت ہی اہم ہیں۔ اور اب وہ تمہارے بھائی کے قبضے میں ہیں۔"

"اُف۔ تت۔ تو کیا۔ ٹرین کو اس نے اغوا کیا ہے؟"

"ہاں! اس کے سوا کون ہو سکتا ہے۔"

"مم۔ میں ابھی اس سے بات کرتی ہوں۔" بیگم ربّانی نے کہا

اور شاید فون کی طرف بڑھنے کے لیے مڑیں،

"نہیں بیگم۔ اس سے نہ تم بات کرو گی۔ نہ میں۔ بات کرنے والے خود بات کریں گے۔ فی الحال تم خود کو گرفتاری لیے پیش کر دو۔"

"یہ۔ یہ آپ کیا کہ رہے ہیں؟"

"مجبوری ہے بیگم۔ میں بھی اپنے آپ کو گرفتار کرا رہا ہوں ٹھیک ہے نا سر۔" یہ کہتے ہوئے میجر ربانی نے کمانڈر انچیف کی طرف دیکھا۔

"ہاں! فی الحال یہ کرنا ہوگا۔ فوجی عدالت میں کیس چلے گا۔ اب جو بھی آپ دونوں کے حق میں فیصلہ ہو۔"

"یا اللہ۔ یہ میں کیا سن رہی ہوں۔"

"انھیں ہیڈ کوارٹر پہنچا دیا جائے۔" میجر ربانی نے اپنے ڈرائیور سے کہا، پھر جلدی سے بولے:

"اور باقاعدہ ہتھکڑیاں لگا کر لے جایا جائے۔"

"بہت بہتر سر۔" ڈرائیور نے کہا۔

"میرے بارے میں کیا حکم ہے سر۔ میں بھی یہیں سے زیرِ حراست آ جاؤں۔ یا مجرم کی گرفتاری تک آپ کے ساتھ رہوں۔"

"ساتھ چل سکتے ہیں، لیکن فرار ہونے کی کوشش نہیں کریں

گے۔" کمانڈر انچیف بولے۔

"مطمئن رہیے سر۔"

اور یہ لوگ وہاں سے بھی نکل آئے۔ سب کے سب دم بخود تھے۔ کیس نے موڑ ہی ایسا لیا تھا۔

ان کی جیپیں راول گنج سٹیشن پر پہنچ کر رک گئیں، لیکن دو منٹ بعد ہی انھیں معلوم ہو گیا۔ مجرم کا وہاں دور دور تک پتا نہیں تھا۔

★

"یہ۔ یہ کیا ہوا۔ وہ تو یہاں نہیں ہے۔" میجر ربانی نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

"وہ یہاں ہو بھی کیسے سکتا ہے۔ اب تو وہ پبلک ٹیلیفون بوتھوں کے آس پاس چکرا رہا ہے۔ کیونکہ اسے بار بار ملٹری آفس کو فون کرنا پڑتا ہے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"تب پھر۔ اب کیا کیا جائے؟" کمانڈر بولے۔

"آپ لوگ ملٹری آفس چلیں۔ اس سلسلے میں بہرحال ہمیں ہی کوئی کام دکھانا ہوگا۔"

"گویا آپ مجرم اور ٹرین کی تلاش میں جائیں گے؟"

"ہاں اور کیا کریں۔اس کے سوا کر ہی کیا سکتے ہیں۔"

وہ لوگ ملٹری آفس چلے گئے۔اور انھوں نے پھر مُون پور کا رُخ کیا:

"تم تینوں نے تو کمال ہی کر دیا۔میں تو ٹرین کے چکر میں اس طرف توجہ ہی نہیں دے سکا۔"انسپکٹر جمشید نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تو ہم ہی کب توجہ دے پائے تھے۔یہ تو بس باتوں باتوں میں بات اس طرف گھوم گئی۔"فاروق نے منہ بنایا۔

"خیر۔کارنامہ تو یہ تم لوگوں کا ہی گنا جائے گا۔"پروفیسر داؤد مسکرائے۔

"لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ اتنے بڑے آفیسر سے اتنی بڑی غلطی کس طرح ہو گئی۔"خان رحمان بڑبڑائے۔

"کیا مطلب؟"وہ چونکے۔

"آخر میجر ربانی کے منہ سے یہ بات اپنی بیگم کے سامنے کس طرح نکل گئی۔"

"بس ہو گئی غلطی۔"

"فوجیوں سے ایسی غلطیاں نہیں ہوتیں۔اور ہوتی ہیں تو پھر انھیں سخت ترین سزا بھی بھگتنا پڑتی ہے۔اس لیے یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ ان سے یہ غلطی ہو کیسے گئی۔"

"خان رحمان۔کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ۔"انسپکٹر جمشید کے لہجے میں بلا کی حیرت تھی، لیکن انھوں نے اپنا جملہ درمیان میں چھوڑ دیا۔

"ہاں! میں یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ میجر ربانی سے یہ غلطی انجانے میں نہیں ہوئی۔"

"کیا!!!"وہ چلائے۔

"بلکہ انھوں نے جان بوجھ کر یہ غلطی کی ہے۔"

"اُف مالک۔تت۔تو۔تو کیا میجر ربانی خود اس سازش میں شریک ہیں۔اور اس وقت انھوں نے خود کو بچانے کی ایک بہترین چال چلی ہے۔"

"میرا خیال تو یہی ہے۔"خان رحمان بولے۔

"یہ بات ہو تو سکتی ہے، لیکن ہو سکتا ہے۔ایسی بات نہ ہو۔خیر ہم اس پہلو سے بھی کیس کو دیکھیں گے۔پہلا مسئلہ تو مسافروں اور کاغذات کا ہے۔"

"میرا خیال ہے جمشید۔ہمیں ان تینوں مقامات کو ایک بار پھر خود سے دیکھنا چاہیے۔اس سازش کی جڑیں اتنی نزدیک نہیں ہیں۔کافی دُور دُور تک پھیلی ہوئی ہیں۔مجرم کے پاس تیاری کے لیے پُورا ایک ہفتہ تھا۔اس نے خوب غور کیا ہو گا اور مکمل تیاری کی ہو گی۔تبھی تو ٹرین اس صفائی

سے غائب کر دی گئی ــ یہاں تک کہ ابھی تک یہ معاملہ راز ہی ہے ــ کہ ٹرین کہاں ہے؟" پروفیسر داؤد جلدی جلدی کہ گئے

"آپ کا خیال ٹھیک ہے ــ ہم ان تینوں جگہوں کو ضرور پھر سے دیکھیں گے ــ اور سب سے پہلے ہمارے راستے میں بند کارخانہ آ رہا ہے۔"

ان کی جیپ بند کارخانے کے پاس آ کر رک گئی ــ پہلے جب وہ یہاں آئے تھے تو انھیں خالد شریف کی لاش پڑی ملی تھی اور اندر راجر سے ملاقات ہوئی تھی۔

"اس وقت ہم نے یہ خیال کیا تھا کہ اس جگہ کو اہم ظاہر کرنے کے لیے اوزاروں، راجر اور لاش کے ذریعے ڈراما رچایا گیا ہے ــ تاکہ ہم اس کارخانے میں ہی اپنا وقت ضائع کرتے رہیں ــ اس لیے ہم زیادہ دیر یہاں نہیں رکے تھے ــ لیکن ــ اب ہم دوسرے پہلو سے کیوں نہ جائزہ لیں ــ اور وہ پہلو یہ کہ وہ سب کچھ ڈراما نہیں تھا ــ خالد شریف ٹرین کی تلاش میں یہاں تک آ گیا تھا ــ اور اس نے شاید کوئی خاص بات محسوس کر لی تھی ــ اسے چونکتے دیکھ لیا گیا اور اس کو بھی ختم کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی ــ لہٰذا یہ کام راجر نے کیا ــ وہ اوزار اٹھانے کے لیے آیا تھا ــ ایک سوال یہ بھی ہے کہ اوزاروں

سے کیا کام لیا گیا تھا ــ اگر گاڑی کو صرف یہاں تک لانے کا پروگرام تھا ــ تو وہ تو کانٹا بدلنے سے ہی آ گئی ہو گی، پھر یہاں ان اوزاروں کی کیا ضرورت پڑ گئی تھی؟" انسپکٹر جمشید کہتے چلے گئے ــ

"اوہ ــ اوہ" فرزانہ کے منہ سے نکلا اور پھر وہ تیزی سے اندر کی طرف دوڑی ــ

انھوں نے دیکھا ــ وہ پٹری کے ساتھ ساتھ دوڑ رہی تھی، یہاں تک کہ اس جگہ پہنچ گئی جہاں ریل کی پٹری ختم ہوتی تھی ــ پھر وہ جھک کر کچھ دیکھنے لگی ــ

اب وہ بھی اس کی طرف تیز تیز قدم اٹھا رہے تھے۔

★

جونہی وہ اس جگہ پہنچے ــ جہاں فرزانہ جھکی ہوئی تھی، اس نے کہا:

"آپ دیکھ رہے ہیں ــ ریل کی پٹری کو یہاں سے ادھر اٹھا دیا گیا ہے۔"

"ہاں تو پھر" خان رحمان بڑبڑائے۔

"اب اگر ہم ــ ان اٹھے ہوئے حصے کو الگ کر دیں تو"

فرزانہ بولی۔

"الگ کر دیں۔ کیا مطلب؟"

"وہ اوزار جو ہم نے دیکھے تھے۔ ان کی مدد سے یہ اُٹھے ہوئے حصّے الگ کیے جا سکتے ہیں۔ اور اس پٹڑی میں کچھ حصّے اور جوڑے جا سکتے ہیں۔"

"لیکن کس لیے؟"

"آگے کارخانے کی پچھلی دیوار ہے۔ جو گری ہوئی ہے اگر ہم پٹڑی اس دیوار سے آگے تک بچھا دیں تو گویا ٹرین کارخانے سے بھی آگے نکل جائے گی۔"

"اور آگے نکال کر مجرموں نے کیا فائدہ اٹھایا ہے۔ ہم اس حصّے کو پہلے بھی دیکھ چکے ہیں۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"یہ اب غور کرنا ہے۔ آئیے۔ ذرا کارخانے کے پچھلے حصّے کو غور سے دیکھ لیں۔"

وہ گری ہوئی دیوار کے درمیان سے نکل کر اس طرف آگئے۔ اور بغور دیکھنے لگے۔

"نہیں بھئی۔ ٹرین یہاں بھی موجود نہیں ہے۔" پروفیسر داؤد نے مایوسانہ انداز میں کہا۔

"میں نے پٹڑی کے نٹ بولٹ کو غور سے دیکھا۔ ان پر تازہ رگڑوں کے نشانات موجود ہیں۔ گویا اُٹھا ہوا حصّہ

الگ کیا گیا تھا۔ اور غالباً مزید پٹڑی بچھائی گئی تھی۔

ارے ہاں۔ اس بات کا تو مجھے خیال اب آیا ہے۔" فرزانہ نے چونک کر کہا۔

"کس بات کا؟"

"آئیے میرے ساتھ۔"

اب اس کا رُخ کارخانے کے اس حصّے کی طرف تھا۔ جس میں انہیں راجر ملا تھا۔ یعنی جہاں بے کار لوہے کا ایک بڑا ڈھیر موجود تھا۔ اور اس ڈھیر کے اندر ہی راجر نے خود کو چھپایا تھا۔ جلد ہی وہ بھی اس ڈھیر کے نزدیک پہنچ گئے۔ فرزانہ آنکھیں پھاڑے اس ڈھیر کو دیکھ رہی تھی:

"اس میں سے ثبوت برآمد ہونے کی اُمید تو نہیں ہے نہیں۔" فاروق گھبرا گیا۔

"ہاں! یہاں بہت بڑے بڑے ثبوت موجود ہیں۔" فرزانہ بڑبڑائی۔

"ارے باپ رے۔" فاروق بولا۔

"وہ دیکھیے ابا جان۔ جس چیز کی ہمیں تلاش تھی۔ وہ ادھر موجود ہے۔"

یہ کہہ کر فرزانہ نے ایک چکر لگایا اور ڈھیر کے دُوسری

طرف پہنچ گئی —

"آج تو فرزانہ تم میرے بھی کان کاٹ رہی ہو" انسپکٹر جمشید مسکرائے —

"ن — نہیں — تو ابّا جان — میری ایسی مجال کہاں۔"

اور پھر ان کی آنکھیں بھی حیرت سے پھیل گئیں —

قہقہہ......قہقہہ

انھوں نے دیکھا — ریل کی پٹری کے بہت سے ٹکڑے لوہے کی بے کار چیزوں میں دبے ہوئے تھے —

"اب بات سمجھ میں آئی — ان ٹکڑوں کی مدد سے ریلوے لائن کو کارخانے کے پچھلے حصّے تک لے جایا گیا ہے" انسپکٹر جمشید بولے —

"لیکن ابّا جان — ٹرین تو وہاں بھی نہیں ہے"

"یہ تو ہم اب دیکھیں گے — پچھلے حصّے کا جائزہ ہم نے اس نظریے سے تو لیا ہی نہیں تھا کہ ٹرین اس طرف بھی لائی جا سکتی ہے — آؤ چلیں" انھوں نے کہا۔

اب وہ گری ہوئی دیوار سے پچھلے حصّے کی طرف آئے۔ بغور جائزہ لینے پر پٹری کے اکھاڑے جانے کے آثار نظر آ گئے — اب تو ان پر جوش طاری ہو گیا — وہ آگے بڑھے، لیکن پھر رک گئے — پٹری کے آثار ختم ہو گئے تھے —

"اب — اب کیا کریں — یہاں سے ٹرین کہاں گئی — ہوا میں تو اُڑ نہیں سکتی تھی" فاروق نے منہ بنایا۔

"ہمیں اور آگے قدم اُٹھانے چاہییں" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"لیکن کیوں ابّا جان — وہ ٹکڑے اتنے زیادہ نہیں ہیں — کہ اتنی دُور تک ٹرین کو لے جایا گیا ہو گا۔"

"بھئی سمجھنے کی کوشش کرو — پچھلے ٹکڑوں کو کھول کر پھر آگے لایا گیا، ٹرین کو آگے سرکایا گیا، پھر ٹکڑوں کو کھولا گیا اور آگے لگا کر ٹرین کو سرکایا گیا — اس طرح کر کے گاڑی کافی آگے لے جائی جا سکتی ہے — لہٰذا چلے آؤ" انھوں نے پُر جوش انداز میں کہا۔

وہ تیز تیز قدم اُٹھاتے آگے بڑھنے لگے — اس قدر جوش سوار تھا کہ کیا کبھی ہوا ہو گا — اور پھر وہ دھک سے رہ گئے، ان کے اُٹھتے قدم رک گئے — آنکھیں پھٹی کی پھٹی اور منہ کھلے کے کھلے رہ گئے — انھوں نے ٹرین کو دیکھ لیا تھا، لیکن کس حالت میں — وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے — پہلے تو وہ سر سے پیر تک لرز اُٹھے، پھر ایک ساتھ چلّائے:

"نہیں !!!"

پتھرائی ہوئی آنکھوں سے انھوں نے پھر اس کی طرف دیکھا — نیچے — بہت نیچے — بہت گہرائی میں ایک کھائی تھی

ٹرین اس کھائی میں گری پڑی تھی —

"اُف اللہ! تو انھوں نے ٹرین کو اس کھائی میں گرا دیا!" پروفیسر داؤد نے کانپ کر کہا۔

"اور — اور مسافر — جمشید۔ مسافر" خان رحمان پاگلوں کی طرح چلّائے —

"ہوش میں رہو خان رحمان — مسافروں کو ضرور انھوں نے نکال لیا ہو گا — آؤ نیچے چل کر دیکھیں۔"

وہ نیچے اُترنے لگے — نیچے اترنا آسان کام نہیں تھا — لیکن بے چینی اور بے قراری انھیں لے جائے جا رہی تھی — کھائی اس قدر گہری تھی کہ ٹرین انھیں بہت غور سے دیکھنے پر نظر آئی تھی —

اور پھر ایک گھنٹہ مسلسل اُترتے رہنے کے بعد — آخر کار وہ ٹرین تک پہنچ گئے —

"بے چاری مرحوم ٹرین" فاروق نے دُکھ بھرے لہجے میں کہا۔

ٹرین کے نزدیک پہنچ کر انھوں نے دیکھا — وہ اب لوہے کا ڈھیر تھی — اس میں کسی مسافر کے آثار انھیں نظر نہیں آئے:

"آؤ چلیں — اللہ کا شکر ہے — انھوں نے مسافروں کو نکال لیا تھا — ورنہ اگر وہ سنگ دلی پر اُتر آتے تو مسافروں سمیت ٹرین کو دھکا دے سکتے تھے" وہ بولے —

اب وہ اُوپر چڑھنے لگے۔ اُوپر تک آنے میں انھیں اُترنے کی نسبت زیادہ دیر لگی۔ اب انھوں نے آس پاس کا جائزہ لیا اور پھر ایک پہاڑ کی طرف بڑھنے لگے۔

"یہاں سے وہ لوگ کس طرف گئے ہوں گے۔ اتنے بہت سے مسافروں کو کنٹرول کرنے کا بھی تو مسئلہ ہوگا۔" خان رحمان بڑبڑائے۔

"یہی دیکھنا ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

پہاڑ کے دامن میں پہنچ کر وہ رُک گئے۔ ایسے میں فرزانہ کے کان کھڑے ہو گئے۔

"ہم۔ میں خطرے کی بُو سونگھ رہی ہوں۔"

"اب صرف بُو سونگھنے سے کیا ہوگا۔ ہمیں تو خطرے میں کودنا ہوگا۔ ورنہ کام نہیں چلے گا۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"جی۔ کیا مطلب؟"

"میں نے اس پہاڑ میں قدرے اوپر جا کر ایک غار جھلک دیکھی ہے۔ ہو نہ ہو۔ وہ لوگ ضرور اس غار میں چھپے ہوئے ہیں۔"

"اوہ۔ تت تو کیا ہم اپنے پستول نکال لیں۔"

"نکال لینے میں کوئی حرج تو ہے نہیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"کیا مطلب۔ آپ کچھ عجیب سے انداز میں باتیں کر رہے

ہیں۔"

"ہاں! یہاں پہنچ کر نہ جانے مجھے کیا ہو گیا ہے۔ میں محسوس کر رہا ہوں۔ ہمیں یہاں پوری فورس لے کر آنا چاہیے تھا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"تت۔ تم ٹھیک کہتے ہو جمشید۔ ہم گھیرے میں آ چکے ہیں۔" خان رحمان بولے۔

"اچانک ہی آپ کو معلوم ہو گیا۔ جب انھوں نے گھیرا ڈالنا شروع کیا تھا، اس وقت کیوں محسوس نہ ہوا؟"

"اس وقت ہم کھائی میں اُتر رہے تھے۔ جب وہ گھیرا ڈال رہے تھے۔"

"اوہ!" وہ بولے۔

"تم لوگوں نے ٹھیک اندازہ لگایا ہے۔ پوری طرح گھیرے میں لیے جا چکے ہو۔ لہٰذا پستول پھینک دو اور ہاتھ اُوپر کر لو۔ یُوں بھی رائفلوں کے ہوتے ہوئے ان پستولوں کی کیا دال گلے گی۔"

"چپ۔ پستولوں کی دال۔" فاروق نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

"تم لوگوں نے سنا نہیں۔ اگر تم نے ہاتھ اُوپر نہ اُٹھائے تو ہم فائرنگ شروع کر دیں گے۔" غرّاتی ہوئی آواز میں کہا

گیا۔

انھوں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ بولنے والا نظر نہیں آ رہا تھا۔ نہ اس کے ساتھی۔ لیکن صاف ظاہر تھا۔ وُہ چٹانوں کی اوٹ میں تھے۔ اور انھیں بہت آسانی سے نشانہ بنا سکتے تھے، پھر انسپکٹر جمشید نے سب سے پہلے ہاتھ اُوپر اُٹھا دیے۔ ان کے بعد دُوسرے بھلا کس طرح رہ سکتے تھے۔

"بہت خوب۔ اب اس غار کی طرف چلو۔ جس کی جھلک تم نے دیکھی تھی۔ جھلک دیکھنے کا کوئی تو فایدہ ہونا چاہیے" ہنس کر کہا گیا۔

وُہ خاموشی سے غار کی طرف قدم اٹھانے لگے۔ اور پھر اس کے منہ تک پہنچ گئے۔ انھیں یُوں محسوس ہوا جیسے کسی وہیل مچھلی کے منہ کے سامنے کھڑے ہوں۔

"دیکھ کیا رہے ہو۔ غار میں داخل ہو جاؤ۔ بہت آرام دہ ہے" بلند آواز ان کے کانوں میں آئی۔

"غار میں داخل ہو کر کہیں ہم پھنس نہ جائیں" فرزانہ بڑبڑائی۔

"لیکن ہم اس وقت کچھ بھی تو نہیں کر سکتے۔ دشمن نظروں کے سامنے ہوتا تو ایک بات بھی تھی" انسپکٹر جمشید بولے۔

"اس کا مطلب ہے۔ ہمیں غار میں داخل ہونا پڑے گا"

"ہاں! اس کے بعد ہی ہم کچھ کرنے کے لیے پر تول سکیں گے" وُہ بولے۔

"پر تول سکیں گے" فارُوق نے حیران ہو کر کہا۔

"بس چُپ رہو۔ تُمھارا یہ شوخ لہجہ اس وقت زہر لگ رہا ہے" محمود نے اسے گھورا۔

"تم تو اس طرح کہہ رہے ہو جیسے یہ سب کیا دھرا میرا ہو" فارُوق نے تِلملا کر کہا۔

"کیے دھرے کی بھی ایک ہی کہی۔ وُہ تو ہوتا ہی تمھارا ہے"

"آؤ بھئی۔ غار ہمارا انتظار کر رہا ہے" انسپکٹر جمشید نے مسکرا کر کہا اور غار میں داخل ہو گئے۔

وُہ ان کے پیچھے چلے۔ غار میں داخل ہونے کے بعد انھوں نے دُور تک دیکھا۔ بے شمار آدمی پریشانی کے عالم میں بیٹھے تھے۔ ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں:

"کیا آپ لوگ ٹرین کے مُسافر ہیں؟"

"ہاں!" کئی آوازیں اُبھریں۔

"اور آپ لوگ؟" کسی نے پُوچھا۔

"ہم آپ لوگوں کی تلاش میں نکلے تھے" انسپکٹر جمشید نے منہ بنا کر کہا۔

"اب کچھ لوگ ہماری تلاش میں نکلیں گے۔" فاروق فوراً بولا۔

"تو آپ بھی پھنس گئے۔"

"دراصل ہم ٹرین کو تلاش کرتے کرتے ان پہاڑوں کے درمیان آ گئے۔ یہ خیال نہیں تھا کہ یہ لوگ یہیں چھپے ہوئے ہوں گے۔"

"لیکن یہ چکر کیا ہے؟" ایک مسافر نے پوچھا۔

"تو آپ لوگوں کو ابھی تک چکر کا پتا نہیں چلا۔"

"جی نہیں۔ انھوں نے تو بس ہمیں اس غار میں بٹھا دیا۔ اور اس کا منہ بند کر دیا تھا۔ حکم یہ تھا کہ منہ سے آواز نہ نکلے اور کوئی باہر نکلنے کی کوشش نہ کرے۔ ورنہ گولیوں سے چھلنی کر دیا جائے گا۔"

"لیکن ہمارے اندر داخل ہونے کے بعد تو غار کا دروازہ۔"

محمود کے ان الفاظ کے ساتھ ہی غار میں گھپ اندھیرا ہو گیا۔ گویا دروازہ بند کر دیا گیا تھا۔

"اگر تم یہ جملہ نہ کہتے تو تمھارا کیا حرج تھا۔" فاروق

۔۔۔

طلب؟

"اس جملے کے بعد ہی انھیں دروازہ بند کرنے کا خیال آیا تھا۔"

"غلط خیال ہے تمھارا۔" محمود نے جھلّا کر کہا۔

"بھئی۔ اندھیرے میں لڑ نہ پڑنا۔" فرزانہ نے ڈری ڈری آواز میں کہا۔

"ک ک۔ کیوں۔ اندھیرا کاٹ کھائے گا کیا؟" فاروق نے بوکھلا کر پوچھا۔

"نہیں۔ اندھیرے بے چارے کو کیا پڑی ہے۔ کاٹ کھانے کی۔ لیکن ہو گا یہ کہ تم مارو گے ایک دوسرے کے۔ لگے گا کسی اور کو۔ بلکہ زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ بے چارے مسافر زد میں آ جائیں گے۔ ہم لوگ تو تمھارے ہتھکنڈوں سے واقف ہیں۔ بچ جائیں گے۔"

"تو ہم ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں۔" فاروق نے بھنّا کر کہا۔

"پپ۔ پتا نہیں۔ میں نے تو یونہی ایک بات کر دی ہے۔"

"یار چپ رہو۔ مسافر پریشان ہو جائیں گے تمھاری باتیں سن کر۔" انسپکٹر جمشید نے تنگ آ کر کہا۔

"نن۔ نہیں جناب۔ ایسی بات تو نہیں ہے۔" ایک مسافر نے کپکپاتی آواز میں کہا۔

"کک۔ کیا مطلب؟" انسپکٹر جمشید چونکے۔

"مطلب یہ کہ ۔ ان کی باتیں تو ہمارے لیے اندھیرے میں روشنی ثابت ہو رہی ہیں ۔ ہمارا دھیان بٹ سا گیا ہے۔"

"چلو ۔ کرلو بات۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

خان رحمان اور پروفیسر داؤد کھی کھی کرنے لگے۔

"کیا آپ لوگوں میں کیپٹن ارشد بھی ہیں؟" انسپکٹر جمشید نے بلند آواز میں کہا۔

"کیپٹن ارشد۔" مسافروں کے منہ سے نکلا۔

"ہاں! یا ان کے اسسٹنٹ راشد صاحب ہیں؟"

"نن ۔ جی نہیں ۔ شاید ہم میں اس نام کے مسافر نہیں ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے ۔ انھوں نے ان دونوں کو کہیں الگ رکھا ہوا ہے ۔ اور باقیوں کو یہاں ۔ تب تو بھئی ۔ ہم غلط جگہ آگئے۔" انسپکٹر جمشید نے پریشان آواز میں کہا۔

"آ کہاں گئے ہیں ابا جان ۔ ہم تو یہاں تک لائے گئے ہیں۔"

"ایک ہی بات ہے۔" فرزانہ نے جھلا کر کہا۔

"یوں کام نہیں چلے گا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"تو پھر جیسے چلتا ہے ۔ چلا لیں ۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں

فاروق نے فوراً کہا۔

"آپ لوگوں نے اس غار میں آگے بڑھ کر تو نہیں دیکھا۔"

"اس قدر اندھیرے میں ہم نے کچھ بھی نہیں کیا ۔ کر بھی کیا سکتے تھے۔"

"ہوں ۔ نکالو بھئی ۔ اپنی پنسل ٹارچ ۔ اب کچھ کام کرنا ہی پڑے گا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

فاروق نے جیب سے ٹارچ نکالنے میں پورا ایک منٹ لگایا ۔ اتنی دیر میں محمود نے جل کر کہا:

"بس ۔ مل چکی تمھیں تو ٹارچ۔"

"ہاں واقعی ۔ مل ہی تو گئی ۔ یہ لیجیے ابا جان۔" فاروق نے ٹارچ والا ہاتھ آگے بڑھایا۔

"یہ ابا جان نہیں ۔ میری ناک ہے ۔ جس پر تم نے ٹارچ دے ماری ہے۔" فرزانہ نے تلملا کر کہا۔

"اوہ ۔ معاف کرنا ۔ ابا جان ۔ آپ کہاں ہیں؟"

"عجیب احمق ہو ۔ بھئی ٹارچ روشن کر کے کیوں آگے نہیں بڑھائی تم نے۔" انسپکٹر جمشید جل گئے۔

"یہی تو مشکل ہے ۔ یہ روشن نہیں ہو رہی ۔ اوہ ۔ سمجھا ۔ تو ٹارچ ہے ہی نہیں۔"

"لیجیے ۔ اور سنیے ۔ ٹارچ صاحب تو ابھی ان کی جیب مبارک

سے برآمد ہی نہیں ہوئیں۔" فرزانہ نے جھنا کر کہا۔

"تت۔ تو پھر۔ جو چیز نکلی ہے۔ وہ ہے کیا؟" محمود نے حیران ہو کر پوچھا۔

"تھتھ۔ تھتھ۔" فاروق کے منہ سے نکلا۔

"اور یہ تھتھ۔ تھتھ کیا ہوتا ہے؟"

"تھرمامیٹر کا بھائی۔"

"تو تم ٹارچ کی بجائے تھرمامیٹر نکال بیٹھے ہو۔ اللہ تم پر رحم فرمائے۔ جیب میں زمانے بھر کی چیزیں بھر رکھی ہیں۔ اس سے تو بہتر تھا۔ کہ میں اپنی ٹارچ نکال لیتا۔"

"اب کیا فائدہ۔ اب تو میں نکال چکا۔"

"کیا۔ تھرمامیٹر؟" فرزانہ جلدی سے بولی۔

"نہیں۔ اس مرتبہ ٹارچ ہی ہے۔ یہ دیکھو۔" فاروق نے کہا اور ٹارچ کی روشنی لہرائی۔

"لاؤ۔ جلدی سے مجھے دے دو۔ کہیں یہ کسی اور چیز میں تبدیل نہ ہو جائے۔" انسپکٹر جمشید نے گھبرا کر کہا۔ خان رحمان اور پروفیسر داؤد مسکرا دیے۔

"آپ سب لوگ یہیں ٹھہریں۔ ہم غار کو اندر سے دیکھنا چاہتے ہیں۔ شاید دوسری طرف باہر نکلنے کا کوئی راستہ ہو۔"

"جج۔ جی۔ بہتر۔" کئی آوازیں ابھریں۔

ٹارچ کی روشنی میں وہ آگے بڑھتے چلے گئے۔ غار ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا اور ان کی حیرت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

"مم۔ مجھے۔ ایسا معلوم ہو رہا ہے۔ کہ یہ غار بالکل سیدھا نہیں ہے۔ نیم دائرے کی صورت میں ہے۔ گویا ہم سیدھ میں آگے نہیں بڑھ رہے۔" فرزانہ بڑبڑائی۔

"کوئی بات نہیں۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ بڑھ تو رہے ہیں۔"

"پتا نہیں۔ یہ کہاں جا کر ختم ہو گا اور کب؟" فاروق بولا۔

"کبھی نہ کبھی اور کہیں نہ کہیں ختم ضرور ہو گا۔ فکر نہ کرو۔" محمود مسکرایا۔

اور پھر واقعی غار ختم ہو گیا۔ لیکن عجیب انداز سے۔ سب سے پہلے فرزانہ چونک کر رکی تھی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیے۔ یہ اشارہ تھا باقی لوگوں کو۔ کہ وہ بھی رک جائیں۔

"مم۔ میں کچھ انسانی آوازیں سن رہی ہوں۔" اس نے دبی آواز میں کہا۔

"تو اچھا کر رہی ہو۔ انسانی آوازیں سننا یوں بھی صحت

کے لیے بہت مفید ہے۔ اور ان حالات میں تو خاص طور پر مفید ہے۔" فاروق نے بھی آہستہ آواز میں کہا۔

"یار تم خاموش نہیں رہ سکتے۔" محمود جھنّا اٹھا۔

"بالکل رہ سکتا ہوں۔ ایسی کون سی بات ہے۔" اس نے کہا۔

اب انھوں نے پوری احتیاط سے آگے بڑھنا شروع کیا۔ دلوں کی دھڑکنیں تیز ہوتی جا رہی تھیں۔ پھر انھوں نے کسی کو کہتے سُنا:

"ایک بار پھر بے ہوش ہو گیا۔ اب کیا کریں باس؟"

"مَیں نے اپنی زندگی میں اتنا ظلم کبھی کسی پر نہیں کیا ہو گا۔ مگر یہ دونوں اس کے باوجود ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ پتا نہیں کس ہڈی کے بنے ہوئے ہیں۔" دوسری آواز اُبھری۔

"اب ایک آخری ترکیب رہ گئی ہے باس۔" وہی آواز اُبھری۔

"آخری ترکیب بھی ان کے ہوش میں آنے پر ہی آزمائی جا سکتی ہے۔" جھنّا کر کہا گیا۔

اب انھوں نے ان لوگوں کو دیکھ لیا۔ وہاں کُل سات آٹھ آدمی تھے۔ جو دو بے ہوش انسانوں کے گرد کھڑے تھے — بے ہوش انسانوں کے جسم ننگے تھے۔ ان ننگے جسموں کو دیکھ کر انھیں جھرجھری سی آ گئی۔ ان جسموں سے جگہ جگہ سے کھال ادھڑی ہوئی تھی۔ ادھڑی ہوئی کھال کی جگہ کو بھی لوہے کی

سلاخوں سے داغ داغ کر سیاہ کر دیا گیا تھا۔ ان کے چہرے اور سر بھی خون سے لتھڑے ہوئے تھے۔ غرض جسم کا کوئی حصّہ بھی ایسا نہیں تھا۔ جہاں سے خون نہ رس گیا ہو۔ ایسے میں انھوں نے اپنے والد کی طرف دیکھ لیا۔

ان کا چہرہ بہت تیزی سے سُرخ ہوتا جا رہا تھا — وہ کانپ گئے۔ اتنا سُرخ چہرہ انھوں نے ان کی زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا —

وہ کہاں تھے

اچانک وہ بجلی کی سی تیزی سے آگے بڑھے۔ ایک ہی لمبی چھلانگ انھیں ان کے قریب لے گئی۔ ان کے دھم سے گرنے کی آواز نے ان سب کو بُری طرح بوکھلا دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتے۔ انسپکٹر جمشید ان پر ٹوٹ پڑے۔ اب وُہ کس طرح کھڑے رہ سکتے تھے۔ انھوں نے بھی دوڑ لگا دی۔ اور پھر غار میں ایک خونریز جنگ شروع ہو گئی۔ وُہ خاموشی سے لڑ رہے تھے۔ خان رحمان انسپکٹر جمشید کے نزدیک پہنچ گئے تھے اور ان کی کمر سے کمر ملا کر دشمنوں پر وار کرنا شروع کر دیے تھے۔ ادھر ان تینوں نے اپنے انداز میں دشمنوں میں کھلبلی مچا دی۔ انھوں نے پہلے تو غار میں پڑے ہوئے پتھروں کی مدد سے ان کے سروں کو نشانہ بنایا۔ پھر خود بھی ان پر ٹوٹ پڑے۔

"ابھی باہر بھی کچھ دشمن موجود ہیں۔ اور نہ جانے کہاں کہاں

چھپے ہوئے ہیں۔ ان لوگوں سے بھی نپٹنا ہو گا۔ لہٰذا ذرا جلدی کرو۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"جی بہتر۔ ہم اور تیز کر دیتے ہیں ہاتھ۔" فاروق نے کہا اور بائیں ہاتھ کا ایک مُکا ایک دشمن کی ناک پر دے مارا۔ وُہ بلبلا اٹھا۔ اتنی دیر میں محمود نے ایک دشمن پر چھلانگ لگائی۔ اور اس کی ٹھوڑی پر ٹکر دے ماری۔ اس نے بچنے کی کوشش کی۔ اور ایک لات اس کی طرف اچھال دی۔ محمود کنی کترا گیا۔ ادھر فرزانہ ایک دشمن کی گردن سے لپٹ گئی تھی اور اس کا گلا گھونٹے دے رہی تھی۔ ایک پروفیسر داؤد تھے۔ جو ایک طرف کھڑے اس لڑائی کو دیکھ رہے تھے۔ اسی وقت انھوں نے ایک دشمن کو غار کے منہ کی طرف کھسکتے دیکھا۔ انھیں اور تو کچھ نہ سوجھا۔ ایک بڑا سا پتھر اُٹھا لیا اور خود بھی دُوسری طرف سے دیوار سے لگ کر آگے بڑھنے لگے۔ اس آدمی کی توجہ لڑائی کی طرف تھی۔ اس لیے پروفیسر اس سے پہلے منہ کی طرف پہنچ گئے اور پھر انھوں نے اللہ کا نام لے کر پتھر اچھال دیا۔ وُہ اس کے سر پر لگا۔ دُوسرے ہی لمحے وُہ گرتا چلا گیا۔

"بھئی۔ آج تو پروفیسر انکل نے بھی کارنامہ انجام دے ڈالا۔" فاروق نے خوش ہو کر کہا۔

"نن - نہیں تو - میں نے تو بس ایک پتھر اچھالا ہے۔" انھوں نے گھبرا کر کہا۔

دو منٹ بعد لڑائی ختم ہو گئی - سب دشمن لمبے لیٹ چکے تھے - غار میں رسی موجود تھی - انھوں نے جلدی جلدی رسی سے انھیں باندھ دیا - وہ جو باہر نکل رہا تھا - ان کا باس تھا۔ اس کی کوشش تھی کہ باہر والے ساتھیوں کو مدد کے لیے بلا لے - اب انھوں نے ان کے اسلحے کو قبضے میں لے لیا - انھیں تیار رہنے کا اشارہ کیا اور غار کے منہ پر آئے - انھوں نے منہ سے سیٹی کی آواز نکالی - اگرچہ نہیں جانتے تھے کہ باس اپنے ساتھیوں کو کس طرح بلاتا ہے - لیکن وہ اور کر ہی کیا سکتے تھے - اچانک انھوں نے دوڑتے قدموں کی آواز سنی - بیسیوں آدمی غار کی طرف آتے نظر آئے - اچانک انسپکٹر جمشید نے باس کی آواز منہ سے نکالی:

"کامیابی ہوگئی - سب آجائیں۔"

"چلو - سب آجاؤ۔" ایک نے بلند آواز میں کہا۔

ایک بار پھر دوڑتے قدموں کی آواز گونجی - اب وہ سب غار کے باہر جمع تھے - انسپکٹر جمشید اور ان کے ساتھی اچانک باہر نکل آئے اور گرج دار آواز میں بولے:

"تم سب ہاتھ اوپر اٹھا دو - ورنہ ہم۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی انھوں نے فائرنگ شروع کر دی، کیونکہ کچھ لوگوں نے رائفلیں سیدھی کرنے کی کوشش کی تھی - ان کی چیخیں بلند ہوئیں اور ان کے لاشے پتھریلی زمین پر تڑپنے لگے:

"بے وقوفو - ہم لوگ اناڑی نہیں ہیں - جس نے بھی حرکت کرنے کی کوشش کی - اس کا انجام یہی ہوگا - پستول اور رائفلیں پھینک دو - فوراً!"

ان کی آواز میں ایسی گھن گرج تھی کہ فوراً رائفلیں اور پستول گرنے کی آواز گونج اٹھی:

"اب پیچھے ہٹنا شروع کر دو - اور اگر کسی نے پستول نہیں پھینکا - تو وہ بھی پھینک دے - ورنہ بعد میں اس کا انجام بھیانک ہوگا۔"

کوئی پستول گرنے کی آواز سنائی نہ دی -

"اچھا تو پھر نیلی ٹوپی والا گیا۔" انسپکٹر جمشید کے منہ سے یہ الفاظ نکلے - ساتھ ہی ایک فائر ہوا اور ایک چیخ بلند ہوئی:

"اس نے پستول نہیں پھینکا تھا - دیکھ لو - اس کے ہاتھ میں اب تک موجود ہے - اگر کسی اور کے پاس پستول موجود ہے - تو وہ بھی پھینک دے - ورنہ اس کا انجام بھی ایسا ہی ہوگا۔"

دو پستول اور گرے۔

"بہت خوب۔ اب ٹھیک ہے۔"

وہ پیچھے ہٹتے چلے گئے۔ پھر ان کو بھی باندھ لیا گیا۔

دراصل یہ غار دو منہ والا تھا۔ دونوں منہ قدرے فاصلے پر تھے اور اندر سے نیم دائرے کی صورت میں ملے ہوئے تھے۔ لیکن درمیانی فاصلہ بہت تھا۔

خان رحمان کو راول گنج کی طرف دوڑایا گیا۔ وہ وہاں سے تمام ملٹری آفیسرز کو لے آئے۔ ان میں میجر ربانی بھی تھے۔ مجرموں پر نظر پڑتے ہی وہ باس کی طرف بڑھنے لگے۔ جو کہ اب ہوش میں آچکا تھا:

"تت۔ تم نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا حیات خان۔ تم اپنی بہن کے ذریعے سے میرے منہ سے معلومات اگلواتے رہے۔ اور میں اس بات کو محسوس نہ کر سکا۔ اب بھی نہ محسوس کرتا۔ اگر ان لوگوں نے ایک خاص نقطہ نہ اٹھایا ہوتا۔" انھوں نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

مجرم کے منہ سے ایک لفظ نہ نکل سکا۔ ایسے میں محمود نے کہا:

"عجیب بات ہے۔ یہ حضرت تو یہاں غار میں تھے۔ پھر یہ فون پر فون کیسے کرتے رہے؟"

"شہر میں اس کا کوئی کارندہ اس کی ہدایات کے مطابق کام کر رہا ہوگا۔ اس کے پاس وائرلیس سیٹ ہوگا۔ یہاں سے بھی وائرلیس سیٹ برآمد ہو جائے گا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"لیکن۔ اس کی گرفتاری بھی تو ضروری ہے۔" فاروق بولا۔

"ہاں ضرور۔ لیکن پہلے وائرلیس سیٹ تلاش کر لو۔"

وائرلیس سیٹ غار میں سے مل گیا۔ انسپکٹر جمشید نے اس کا بٹن آن کیا اور پھر باس کی آواز میں ہیلو ہیلو کرنے لگے۔ جلد ہی جواب میں ہیلو کہا گیا:

"کام بن گیا ہے۔ اب تم بھی یہاں پہنچ جاؤ۔"

"او کے باس۔" دوسری طرف سے کہا گیا اور انھوں نے سیٹ بند کر دیا۔

"ترکیب اچھی رہی۔ وہ۔ وہ کاغذات تو رہ ہی گئے۔ آخر وہ کہاں ہیں؟"

"کیپٹن ارشد اور ان کے سارجنٹ راشد کو معلوم ہے۔ کاغذات کہاں ہیں۔ ہمیں معلوم کرنے کی ضرورت نہیں۔"

"نہیں اب ایسی بھی بات نہیں۔ میرا خیال ہے۔ اب تو ہم بتا ہی سکتے ہیں۔" کیپٹن ارشد نے بجھی بجھی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ تھوڑی دیر پہلے وہ ہوش میں آچکے تھے۔

"چلیے پھر بتا ہی دیں۔" خان رحمان بولے۔

"جب گاڑی کے ڈبّے پر دستک دی گئی تھی، میں اُسی وقت سمجھ گیا تھا کہ دستک دینے والے ملٹری کے آدمی نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ ان کے اور میرے درمیان دستک کا انداز طے ہو چکا تھا۔ لہٰذا میں نے گڑبڑ محسوس کی۔ ادھر راشد دروازہ کھولنے کے لیے اُٹھ چکا تھا۔ یہی وُہ لمحہ تھا جب میں نے مخالف سمت کی کھڑکی ذرا سی کھولی اور باہر جھانکا۔ نیچے ایک جوہڑ نظر آیا۔ بس میں نے کاغذات اس جوہڑ میں گرا دیے۔"

"کیا!!" وُہ سب کے سب چلّا اُٹھے۔

"تب تو کاغذات ضائع ہو گئے۔" پروفیسر داؤد حسرت زدہ انداز میں بولے۔

"ہاں! ان کا ضائع ہو جانا ہی بہتر تھا۔ اس کی نقل ہیڈ کوارٹر میں موجود ہے۔ لیکن اگر وُہ ہمارے پاس ہوتے تو دشمن ضرور انھیں حاصل کر لیتا۔"

"ایک بات اور۔ جب آپ کاغذات ضائع کر چکے تھے۔ تو پھر ظلم برداشت کرنے کی کیا ضرورت تھی آپ انھیں بتا دیتے۔" محمود بولا۔

"پہلی بات تو یہ کہ یہ اعتبار نہ کرتے۔ دُوسری یہ کہ میں نے سوچا۔ کیا خبر۔ پانی کاغذات کو کس حد تک خراب کرے ہو سکتا ہے۔ ابھی پوری طرح ضائع نہ ہوئے ہوں۔ اور یہ ان سے

کوئی فائدہ اُٹھا لیں۔ اس لیے میں نے یہ بات بھی انھیں نہیں بتائی، یہ اطمینان تو ہو ہی چکا تھا کہ یہ اب ان کاغذات کو حاصل نہیں کر سکیں گے۔"

"اوہ!" ان سب کے مُنہ سے نکلا۔

"ارے۔ وُہ تو رہ ہی گیا۔" محمود نے چونک کر کہا۔

"کیا رہ گیا؟" فرزانہ نے حیران ہو کر کہا۔

"بس۔ سہرا۔"

"اوہ ہاں۔ واقعی۔ اس کیس کا سہرا کس کے سر باندھا جائے۔" فارُوق بولا۔

اور پھر ان کی نظریں ایک سمت میں اُٹھ گئیں۔

"یہ رہے۔ سہرے کے حق دار۔" فارُوق کے منہ سے نکلا۔

اور ان کے چہروں پر مسکراہٹیں دوڑ گئیں۔

ٹرین کی تلاش

کا انعامی سوال

س : اس کیس کا سہرا کس کے سر رہا ؟

- پہلے موصول ہونے والے ایک سو درست جوابات میں سے دس قارئین کو انعام دیا جائے گا۔
- قرعہ اندازی کے ذریعے دو قارئین کو ۵۰۰،۵۰۰ روپے کا نقد ا... اور آٹھ قارئین کو ادارہ اپنی پسند کی ۵، ۵ کتابوں کے پیکٹ بطورِ انعام روانہ کرے گا۔
- ایک لفافے میں تمام ناولوں کے جوابات الگ الگ کاغذ پر لکھ کر ارسال کیے جا سکتے ہیں، لیکن ہر ناول کا صرف ایک جواب ارسال کریں۔
- خطوط درج ذیل پتے پر ارسال کریں :

اشتیاق احمد

ڈی ۶/۸ سٹیلائٹ ٹاؤن ● جھنگ ● پوسٹ کوڈ ۳۵۲۰۰

آئندہ ناول کی ایک جھلک

محمود، فاروق، فرزانہ اور انسپکٹر جمشید سیریز ۱۷۴

آخری جھٹکا

مصنف : اشتیاق احمد

- فرزانہ نے ایک شخص کو آتے دیکھا اور پھر وہ غائب ہو گیا ——
- انھوں نے اردگرد کی تلاشی لی۔ دیکھا بھالا۔ لیکن وہ کہیں بھی نظر نہ آیا۔
- حالاں کہ وہاں سے نکلنے کا کوئی راستا نہیں تھا ——
- اور پھر اس کی لاش انھیں ملی ——
- لاش کے پاس ایک عجیب چیز موجود تھی ——
- ایک جاسوسی کہانی۔ اس قسم کی کہانیوں کی آپ بہت مرتبہ فرمائش کر چکے ہیں۔
- مجرم کی تلاش میں اس مرتبہ انھیں چکر پر چکر آئے ——

قیمت : ۵۰/۷ روپے